

# لذت سنگ

افسانے

سعادت حسن منٹو

# لذت سنگ

## دیباچہ

”لاہور کے ایک رسوائے عالم رسالے میں جوفاٹی و بیہودگی کی اشاعت کو اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے، ایک افسانہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ”بو“ اور اس کے مصنف ہیں مسٹر سعادت حسن مندو۔ اس افسانے میں فوجی عیسائی لڑکوں کا کیر کیٹر اس درجہ گند اب تایا گیا ہے کہ کوئی شریف آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔ افسانہ نگار نے اظہار مطلب کے لیے جو اسلوب اختیار کیا ہے اور جو الفاظ منتخب کے ہیں ان کے لیے تہذیب، شرافت کے دامن میں کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن حکومت اب تک خاموش ہے حالانکہ یہی حکومت ہے جو ”لذت النساء“ اور ”کوک شاستر“ ایسی فنی (یا استفہام یہ میرا ہے) کتابوں کو بھی قابل موافخذہ سمجھتی ہے، لیکن ایسے افسانوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتی، جو ادب جدید کے نام سے سفلی جذبات میں ہاچل ڈالنے کا موجب ہیں اور فاخت نگار ادیبوں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ وہ قانون کی گرفت سے بے نیاز ہو کر گندگی بکھیرتے رہتے ہیں۔“

(ہفتہوار ”حیام“ لاہور)

”پریس برائج کے انچارج چودھری محمد حسین بہت نیک خیال کے بزرگ ہیں۔ اس قسم کے افسانے پڑھ کر ان کی روح یقیناً کا ان پر اٹھتی ہے۔ ان کے ہاتھ میں قانون ہے اور وہ اسے نہایت سختی سے استعمال کر سکتے ہیں۔ کیا ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ جس طرح قابل اعتراض مذہبی مضمایں لکھنے والوں کے خلاف گورنمنٹ کی مشینزی حرکت میں آئی، اسی طرح ان گندے افسانوں کو لکھنے والے سعادت حسن مندو وغیرہ بیچنے والے پبلشر جو رسالے کی فروخت سے ہزاروں روپیہ کماتے ہیں اور چھاپنے والے پریس کے مالک کو فوراً گرفتار لیتے اور ان میں سے ہر ایک کو تین تین سال کے لیے جیلوں میں بند کراویتے۔ ہمیں یقین ہے کہ کوئی بھی عدالت ان افسانوں کو قانون کی زد سے نہیں بچنے دے گی۔ یہ صاف طور سے نوجوان لڑکوں اور لڑکوں میں بد اخلاقی پھیلاتے ہیں اور عوام کا

ذائق بگاڑتے ہیں۔"

(روزمانہ "پر بحثات" لاہور)

"ادب اطیف" اس نام کا ایک رسالہ لاہور سے شائع ہوتا ہے یہ کہنے کو تو ایک ادبی ماہنامہ ہے لیکن اگر اسے ادب کشف کہنے تو بجا ہے۔ اس کا سالانہ نمبر اس وقت ہمارے پیش نظر ہے جس میں ایک لپچر اور فرش افسانہ از قلم فرش تھا اس سعادت حسن منشو شائع ہوا ہے جس کے خلاف ہم نہایت پر زور احتجاج کرتے ہیں۔ فقط اس کے کوک شاسترانہ خیالات کی وجہ سے بلکہ اس لیے بھی کہ یہ گورنمنٹ عالیہ کی دیزراگز اری کور (WAC) کی مسامی رباب جنگ کی راہ میں روڑا ہکانے والا اور اس کی بدناہی کا موجب ہے حتیٰ کہ اس محلہ کو بیہودہ شخص قبجہ خانہ کا نام دیتا ہے۔ ہم جیران ہیں کہ اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر گورنمنٹ کی مشینی فوراً حرکت میں آ جاتی ہے لیکن اس خلاف تہذیب مضمون پر اس کی اب تک نظر نہیں پڑی۔ کیا پر شنڈٹ پر میں برائی اس بد اخلاق اور بے ادب "اویب" اور سالہ مذکور کے خلاف جلد کوئی کارروائی نہ کریں گے؟ دیکھا چاہیے!

("اخوت" لاہور)

"ایک مقامی ماہنامہ نے سعادت حسن منشو کا ایک فرش افسانہ "بُو" شائع کیا تھا۔ "خیام" میں اس اخلاق سوز حرکت کے خلاف آواز اصحابی گئی تھی جو حکومت پنجاب کے کانوں تک پہنچے بغیر نہ رہ سکی، چنانچہ معلوم ہوا کہ جس پرچے میں "بُو" شائع ہوا تھا وہ ضبط کر لیا گیا ہے۔ یہ ضبطی ۲۹۲/۳۸ دفعہ کے ماتحت عمل میں آئی۔ ہم اس فیصلے پر حکومت پنجاب کو سختی تبریک سمجھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اس قسم کی فاشی کو مستقل طور پر روکنے کے لیے کوئی موثر قدم اٹھائے گی۔"

(ہفتہوار "خیام" ۱۸ میل مارچ ۱۹۸۳ء)

۳۱ ملک بلڈنگ، میور وڈلاہور  
بھائی جان، سلام شوق!

برادرم آغا خلش صاحب کا گرامی نامہ پرسوں ملا تھا۔ آپ ک علالت کا علم ہوا اللہ کرے آپ اب تک اچھے ہوں جب آپ کو اپنی صحت کا اندازہ ہے تو اتنا زیادہ کام کیوں کرتے ہیں کہ دونوں صاحب فراش رہتے ہیں۔ مجھے لوٹی ڈاک میں اپنی صحت کی حالت سے مطلع کیجئے اور اللہ تعالیٰ محنت نہ کیجئے کہ آپ انجکشن کے کانٹوں میں گھرے رہ جائیں۔ ابھی برسوں تک آپ کی ضرورت ہے۔ لیجئے

خیام عالمگیر آئینہ (بسمی) اور دیگر مہربانوں کے دم سے "ادب اطیف" کا سالنامہ زیر دفعہ ۲۹۲ تحریرات ہند اور ۳۸ ڈینس آف انڈیا رولز ۲۹ مارچ کو شام کو ضبط ہو گیا۔ پولیس نے چھاپ مارا۔ سالنامے کے باقیماندہ نمبر لے گئی، بھی پروپرائزروں اور ایڈیٹرزوں کی گرفتاری عمل میں نہیں آئی، لیکن افواہ ہے کہ ہم بہت جلد گرفتار کر لیے جائیں گے۔ یہ ضبط آپ کے مضمون اور افسانے کی وجہ سے عمل میں آئی ہے۔

(احمد ندیم قاسمی آئیڈیٹر "ادب اطیف")



مضمون جس کا ذکر محوال صدر خط میں ہے ایک تقریر ہے جو میں نے جو گیشوری کالج بسمی میں طالب علموں کو پڑھ کر سنائی تھی۔ اس سے پہلے چند اصحاب ادب جدید کے خلاف اس کالج میں تقریریں کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کالج کی مجلس ادب کی دعوت قبول کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ تقریر بعد میں ادب جدید کے عنوان سے "ادب اطیف" کے زیر عتاب سالنامہ ۱۹۳۳ء میں میرے افسانے "بو" کے ساتھ شائع ہوئی۔ میں اسے ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

"میرے مضمون کا عنوان "ادب جدید" ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ میں اس کا مطلب ہی نہیں سمجھتا۔ لیکن یہ زمانہ ہی کچھ ایسا ہے کہ لوگ اسی چیز کے متعلق باتیں کرتے ہیں جن کا مطلب ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ پچھلے دنوں گاندھی جی نے آغا خان کے محل میں مرن برداشت کرنا۔ جب لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا وہ کس طرح زندہ رہ سکتے ہیں تو ایک نارنگی پیدا کر دی۔ یہ نارنگی بھی پچھلے دنوں کے بعد تاقابل فہم ہو گئی۔ بعض آدمیوں نے کہا کہ نارنگی نہیں تھی، موی تھی۔ بعض نے کہا نہیں موبی، نارنگی ہرگز نہیں تھی، مالٹا تھا۔ بات بڑھتی گئی۔ چنانچہ اس پھل کی ساری ذاتی گنجیں۔ نارنگی، سکنتر، موبی، مالٹا، چکوتہ، سویٹ لائم، کھٹالیموں، میٹھا لیموں، غیرہ وغیرہ۔ پھر ڈاکٹروں نے ان میں سے ہر ایک کی وٹا منزگنواں میں۔ غذا سیت کو کیلوریز میں تقسیم کیا گیا۔ ایک برس میں پھر برس کے پڑھے کو تین کیلوریز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس پر بحث کی گئی اور صاحب گاندھی جی کی یہ نارنگی یا موبی جو کچھ بھی تھی، سعادت حسن مندوں گئی۔ یہ میرا نام ہے لیکن بعض لوگ ادب جدید المعرف نے ادب یعنی ترقی پسند ادب کو سعادت حسن منو بھی کہتے ہیں اور جنہیں صنف کرخت پسند نہیں وہ اے عصمت چعتائی بھی کہہ لیتے ہیں۔

جس طرح میں، یعنی سعادت حسن مندوں پے آپ کو نہیں سمجھتا اسی طرح ادب جدید المعرف نیا ادب یعنی ترقی پسند لشی پر بھی میری فہم سے بالاتر ہے اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ ان لوگوں کی سمجھ سے بھی سوچا ہے جو اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے

طور پر چند مضمونوں میں اس ادب کو جس کے کئی نام ہیں اور زیادہ نام دینے کے لیے نوش لگاری اور مزدور پرستی سے منسوب کیا گیا ہے۔ میں چیزوں کے نام رکھنے کو برائیں سمجھتا۔ میرا اپنا نام اگر نہ ہوتا تو وہ گالیاں کیسے دی جاتیں؟ جواب تک میں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں اپنے نقادوں سے وصول کر چکا ہوں۔ نام ہو تو گالیاں اور شاباشیاں دینے اور لینے میں بہت سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر ایک ہی چیز کے بہت سے نام ہوں تو الجھاؤ پیدا ہونا ضروری ہے۔

سب سے بڑا الجھاؤ اس ترقی پسند ادب کے بارے میں پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ادب یا تو ادب ہے ورنہ ادب نہیں ہے۔ آدمی یا تو آدمی ہے ورنہ آدمی نہیں ہے، گدھا ہے۔ مکان ہے، نیز ہے یا کوئی اور چیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سعادت حسن منثورتی پسند انسان ہے۔ یہ کیا بیہودگی ہے۔ سعادت حسن منثور انسان ہے اور ہر انسان کو ترقی پسند ہونا چاہیے۔ ترقی پسند کہہ کر لوگ میری صفت بیان نہیں کرتے بلکہ اپنی برائی کا ثبوت دیتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود ترقی پسند نہیں، یعنی وہ ترقی نہیں چاہتے۔ میں زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کا خواہش مندر ہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب ترقی کریں۔ آج آپ طالب علم ہیں ترقی کرتے کرتے آپ بھی اپنے آئینہ میں تک پہنچ جائیں۔

ہر آدمی ترقی پسند ہے۔ وہ لوگ جنہیں تحریکی یا رجعت پسند کہا جاتا ہے، خود کو ترقی پسند ہی سمجھتے ہیں۔ اور پھر زمانے میں قریب قریب ہر آدمی گزری ہوئی نسل کے مقابلے میں اپنے کوز یادہ ذہین، طبع اور ترقی یافتہ انسان ہی سمجھتا ہے۔ یہی حال ادب کا ہے۔ شر کے ناول اور راشد الخیری کے قصے آج کل کے اکثر مصنفوں کو بالکل بے جان معلوم ہوتے ہیں۔ پڑھنے والوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ مارکیٹ میں چلے جائیے۔ آج سے دس بیس برس پہلے کے لکھنے والوں کی کتابیں اسٹالوں پر بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔ کرشن چند راجہندر سنگھ بیدی، عصمت چعاتی اور سعادت حسن منثور کتابیں؛ ایم اسلام، تیر تھرام فیروز پوری، سید امیاز علی تاج اور عابد علی عابد کے مقابلے میں زیادہ پڑھی جاتی ہیں، اس لیے کہ کرشن چندرا اور اس کے ہم عصر نوجوانوں نے زندگی کے نئے تجربے بیان کئے۔

آج سے بیس پچیس برس پہلے ملک کی سیاسی اور مجلسی حالت بالکل مختلف تھی۔ اسی طرح آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پچاس سالہ برس اور پہلے کیسی ہو گی، اور اگر مظاہری حکومت کا دور دورہ ہوتا تو بہت ممکن ہے میرے گھر میں ایک حرم سرائے ہوتی۔ حرم سرائے نہ ہوتی تو کم از کم ایک بیوی گھر میں ہوتی، اور دو تین طواں میں میری ملازمت میں ہوتیں، مجھے بنیز لرانے کا شوق تھا۔ یہ مضمون پڑھنے کے بعد میں پہلی صاحب بالقابہ کی شان میں ایک قصیدہ سناتا جو خوش ہو کر یا تو میرا منہ موتیوں سے بھردیتے یا جو گیشوری کا لمحہ مجھ سے دیتے تاکہ میں اپنے اپنا طویلہ بناسکوں۔ مگر جیسا کہ آپ جانتے ہیں، حالت بہت مختلف ہے۔ مجھے یہاں سے پیدل اٹیش جانا

پڑے گا اور فلمستان میں اپنے آقاوں کو جواب دینا پڑے گا کہ میں اتنی دیر ڈاکٹر کے پاس کیا کرتا رہا۔ ان سے جھوٹ بول کر آیا ہوں کہ ڈاکٹر سے ٹیک لگوانے جا رہا ہوں۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ حالات بہت مختلف ہیں اور یہ اختلاف ہی ادب میں مختلف رنگ پیدا کرتا ہے۔ پہلے فارغ الابالی تھی، لوگ آرام پسند اور عیش پرست تھے۔ اس زمانے کے ادب میں آپ کو بہت سی دماغی عیاشیاں نظر آ سکتی ہیں۔ وہ غنو دی یجھی آپ محسوس کریں۔ آج کا شاعر اپنی جواں مرگی پر زور دار نوح لکھتا ہے۔ اس عہد کا قصہ نویس جنوں اور پریوں کی داستانیں لکھ کر نام پیدا کرتا تھا۔ آج کا افسانہ نویس ان مردوں اور عورتوں کی کہانیاں لکھتا ہے جو جنوں اور پریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔ اس دور کا ادیب مطمئن انسان تھا، آج کا ادیب ایک غیر مطمئن انسان ہے۔ اپنے ماحول اپنے نظام اپنی معاشرت اپنے ادب، حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی۔ اس کی اس بے اطمینانی کو لوگوں نے غلط نام دے رکھے ہیں۔ کوئی اسے ترقی پسند کرتا ہے، کوئی فخش نگاری اور کوئی مزدور پرستی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان ادیبوں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ہبھوت آدم سے لے کر اب تک ہر مرد کے اعصاب پر عورت سوار رہی ہے۔ اور کیوں نہ رہے مرد کے اعصاب پر کیا ہاتھی گھوڑوں کو سوار ہونا چاہیے۔ جب کبوتر، کبوتروں کو دیکھ کر گلتے ہیں تو مرد عورتوں کو دیکھ ایک غزل یا افسانہ کیوں نہ لکھیں۔ عورتیں، کبوتروں سے کہیں زیادہ دلچسپ خوبصورت اور فکر انگلیزیں ہیں۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں، آج سے کچھ عرصہ پہلے شاعری میں عورت کو ایک خوبصورت لڑکا بنادیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے کے شاعروں نے اس میں کوئی مصلحت دیکھی ہوگی۔ مگر آج کے شاعر اس مصلحت کے خلاف ہیں۔ وہ عورت کے چہرے پر بزرے یا خط کے آغاز کو بہت ہی مکروہ اور خلاف فطرت سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی اس کو اس کی اصلی شکل ہی میں دیکھیں۔ خدا لگتی کہنے، کیا آپ اپنی محبوبہ کے گالوں پر داڑھی پسند کریں گے؟

میں عرض کر رہا ہوں کہ زمانے کی کروٹوں کے ساتھ ادب بھی کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ آج اس نے جو کروٹ بدلتی ہے اس کے خلاف اخباروں میں مضمون لکھنا یا جلوں میں زہرا لکھنا بالکل بیکار ہے۔ وہ لوگ جو ادب جدید کا ترقی پسند ادب کا، فخش ادب کا یا جو کچھ بھی یہ ہے، خاتمه کر دینا چاہتے ہیں تو اس کا راستہ یہ ہے کہ ان حالات کا خاتمہ کر دیا جائے، جو اس ادب کے محرك ہیں۔ محمود آباد کے راجد صاحب کا حیدر آباد کے شاعر ماہر القادری صاحب کا یا بھبھی کے دو افراد حکیم مرزا حیدر بیگ صاحب کا اس لڑپچر کے خلاف ریزو لیوٹن پاس کرتا بالکل بیکار ہے۔ جب تک عورتوں اور مردوں کے جذبات کے درمیان ایک مولیٰ دیوار حائل رہے گی، عصمت چھٹائی اس کے چونے کو اپنے تیز ناخنوں سے کریدتی رہے گی؛ جب تک کشمیر کے حصیں دیہاتوں میں شہروں کی گندگی پھیلی رہے گی، غریب کرشن چند رہو لے ہو لے روتا رہے گا۔ جب تک انسانوں میں اور خاص طور پر سعادت حسن منشوں میں کمزور یاں موجود ہیں، وہ

خوردنیں سے دیکھ دیکھ کر باہر نکالتا اور دوسروں کو دکھاتا رہے گا۔ راجہ صاحب محمود آباد اور ان کے ہم خیال کرتے ہیں۔ یہ سراسر بیہودگی ہے۔ تم جو کچھ لکھتے ہو، خرافات ہے۔ میں کہتا ہوں، بالکل درست ہے۔ اس لیے کہ میں بیہود گیوں اور خرافات ہی کے متعلق لکھتا ہوں۔ راجہ صاحب محمود آباد ایک کانفرنس کے صدر بن جائیں یا حکیم حیر بیگ صاحب کھانی دور کرنے کا مجرب شربت ایجاد کریں، مجھے ان کی صدارت اور ان کے شربت سے کوئی دلچسپی نہیں، البتہ جب میں ٹرین میں بیٹھا بیٹھا اپنا نیا خریدا ہوا قیمتی پن نکالتا ہوں، صرف اس غرض سے کہ لوگ دیکھیں اور مرعوب ہوں تو مجھے اپنا سغلہ پن بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔

میرے پڑوں میں اگر کوئی عورت ہر روز خاوند سے مارکھاتی ہے اور پھر اس کے جو تے صاف کرتی ہے تو میرے دل میں اس کے لیے ذرہ برابر ہمدردی پیدا نہیں ہوتی، لیکن جب میرے پڑوں میں کوئی عورت اپنے خاوند سے لڑکر اور خود کشی کی دھمکی دے کر سینما دیکھنے چلی جاتی ہے اور میں خاوند کو دیکھنے سخت پریشانی کی حالت میں دیکھتا ہوں تو مجھے دونوں سے ایک عجیب و غریب حشم کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی لڑکے کو لڑکی سے عشق ہو جائے تو میں اسے زکام کے برابر اہمیت نہیں دیتا، مگر وہ لڑکا میری آوج کو اپنی طرف ضرور کھینچنے کا جو ظاہر کرے کہ اس پر سینکڑوں لڑکیاں جان دیتی ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ محبت کا اتنا ہی بھوکا ہے جتنا بیگال کا فاقہ زدہ باشدہ۔ اس بظاہر کا میاب عاشق کی رنگین باتوں میں جوڑ بیجڈی سکیاں بھرتی ہوں گی، اس کو میں اپنے دل کے کانوں سے سنوں گا اور دوسروں کو سناوں گا۔ بھی پیمنے والی عورت جو دن بھر کام کرتی ہے اور رات کو اطمینان سے سو جاتی ہے، میرے افسانوں کی ہیروئین نہیں ہو سکتی۔ میری ہیروئین چلکے کی ایک نکھرانی رندی ہو سکتی ہے جو رات کو جا گتی ہے اور دن کو سوتے میں بھی بھی ڈراڈنا خواب دیکھ کر رائٹھ بیٹھتی ہے کہ بڑھا پا اس کے دروازے پر دستک دینے آ رہا ہے۔ اس کے بھاری بھاری پوٹے جن پر برسوں کی چٹی ہوئی نیندیں مخمد ہو گئی ہیں، میرے افسانوں کا موضوع بن سکتے ہیں۔ اس کی غالاٹت، اس کی بیماریاں، اس کا چڑیچڑا پن، اس کی گالیاں یہ سب مجھے بھاتی ہیں۔ میں ان کے متعلق لکھتا ہوں اور گھر میلوں عورتوں کی شستہ کلامیوں، ان کی صحت اور ان کی نفاست پسندی کو نظر انداز کر جاتا ہوں۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ نئے لکھنے والوں نے عورت اور مرد کے جنسی تعلقات ہی کو اپنا موضوع بنالیا ہے۔ میں سب کی طرف سے جواب نہیں دوں گا، اپنے متعلق کہوں گا کہ یہ موضوع مجھے پسند ہے۔ کیوں ہے..... بس ہے۔ مجھے مجھے کہ مجھ میں Perversion ہے اور اگر آپ قلندر ہیں، چیزوں کے عوافت و عواطف اچھی طرح جانچ کتے ہیں تو مجھ لیں گے کہ یہ بیماری مجھے کیوں لگی ہے۔ زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں، اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھئے۔ اگر آپ ان

افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابل برداشت ہے۔ مجھ میں جو برا نیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں۔ میری تحریر میں کوئی نقش نہیں۔ جس نقش کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے دراصل موجودہ نظام کا نقش ہے۔ میں ہنگامہ پسند نہیں۔ میں لوگوں کے خیالات و جذبات میں ہیجان پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں تہذیب و تمدن اور سوسائٹی کی چولی کیا اتنا روں گا جو ہے ہی نگی۔..... میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا، اس لیے کہ یہ میرا کام نہیں درزیوں کا ہے۔ لوگ مجھے سیاہ قلم کہتے ہیں، میں تختہ سیاہ پر کالی چاک سے نہیں لکھتا، سفید چاک استعمال کرتا ہوں کہ تختہ سیاہ کی سیاہی اور بھی نمایاں ہو جائے۔ یہ میرا خاص انداز میرا خاص طرز ہے جسے فرش نگاری، ترقی پسندی اور خدا معلوم کیا کچھ کہا جاتا ہے۔ لعنت ہو سعادت حسن منثور، کم بخت کو گالی بھی سلیقے سے نہیں دی جاتی۔

جب میں نے لکھنا شروع کیا تو گھر والے سب بیزار تھے۔ باہر کے لوگوں کو بھی میرے ساتھ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے۔ ”بھی کوئی نو کری ہلاش کرو۔ کب تک بیکار پڑے افسانے لکھتے رہو گے۔“ آٹھویں برس پہلے افسانہ نگاری بیکاری کا دوسرا نام تھا، آج اسے ادب جدید کہا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن نے کافی ترقی کر لی ہے۔ وہ وقت بھی آجائے گا جب اس جدید ادب کا صحیح مطلب واضح ہو جائے گا اور حکیم حیدر بیگ صاحب دہلوی کو اپنے شفاقتانے سے انکھ کرنے لکھنے والوں کے روگ کی تشخیص نہیں کرنا پڑے گی۔

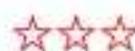
جب سے جنگ شروع ہوئی ہے ادب جدید پر ایک نئے زاویے سے حملہ کیا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب ساری دنیا جنگ کے شعلوں میں لپٹی ہے، ہر روز ہزاروں انسانوں کا خون مٹی میں مل رہا ہے۔ فنا بادہ ہر جام بنی ہے۔ دوسری اجناس کی طرح انسانوں کے گوشت پوست کی دکانیں بھی کھلی ہیں۔ یہ نئے لکھنے والے کیوں خاموش ہیں؟۔۔۔۔۔ کیا ان کے قلم صرف جنیات کی روشنائی میں ڈوبتے ہیں؟۔۔۔۔۔ دنیا کا نقشہ بدل رہا ہے۔۔۔۔۔ ہر لمحہ ہر گھری ایک نئے طوفان کا پیغام لارہی ہے مگر ان کے دل و دماغ پر ایسا جمود طاری ہے کہ دور ہی نہیں ہوتا۔

میں پھر دوسروں کی طرف سے جواب نہیں دوں گا۔۔۔۔۔ اپنے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا کا نقشہ واقعی بدل رہا ہے لیکن اگر میں نے اس کے متعلق کچھ لکھ دیا تو میرا حلیہ بھی بدل جائے گا۔ ڈرپوک آدمی ہوں، جیل سے بہت ڈر لگتا ہے۔ یہ زندگی جو برس کر رہا ہوں، جیل سے کم تکلیف وہ نہیں۔ اگر اس جیل کے اندر ایک اور جیل پیدا ہو جائے اور مجھے اس میں ٹھوٹ دیا جائے تو چکلیوں میں دم گھٹ جائے۔ زندگی سے مجھے پیار ہے، حرکت کا دلدار ہوں، چلتے پھرتے، سینے میں گولی کھا سکتا ہوں لیکن جیل میں کھٹل کی

موت نہیں مرتا چاہتا۔ یہاں اس پلیٹ فارم پر یہ مضمون سناتے سناتے آپ سب سے مارکھالوں گا اور اف تک نہیں کروں گا، لیکن ہندو مسلم فساد میں اگر کوئی میرا سر پھوڑ دے تو میرے خون کی ہر بوندروتی رہے گی۔ میں آرٹس ہوں اور اوچھے زخم اور بجھدے گھاؤ جھے پسند نہیں۔ جنگ کے بارے میں کچھ لکھوں اور دل میں پستول دیکھنے اور اس کو چھوٹے کی حضرت دبائے کسی تنگ و تاریک کو ٹھہری میں مرجاوں ۔۔۔۔۔ ایسی موت سے تو میکی بہتر ہے کہ لکھتا وکھنا چھوڑ کر ذیری فارم کھول لوں اور پانی ملا دو وہ بیچنا شروع کر دوں۔ میں اس جنگ کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا۔ گولے اور تار پیڑا وایک طرف رہے میں نے تو آج تک ہوا کی بندوق بھی نہیں چلائی۔ بچپن کی بات ہے ہمارے پڑوس میں ایک تھانے دار رہتے تھے ان کے پاس پستول تھا۔ پینی اتار کر جب وہ پنگ پر رکھتے تو سب بچوں سے کہہ دیا جاتا، دیکھو اس کمرے میں مت جانا، وہاں پستول پڑا ہے۔ کبھی کبھی ہم ڈرتے ڈرتے اس کمرے میں چلے جاتے۔ دور کھڑے رہ کر اس خطرناک آلے کی طرف دیکھتے تو دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ پڑے پڑے وہ پستول دخ جائے گا۔ اب بتائیے میں اور میرے دوست ٹیکنوں کے بارے میں کیا لکھیں گے!

مجھے چست وردی پہننے کا شوق نہیں ہے۔ پتیل اور تابنے کے تغدوں اور کپڑے کے رنگیں بلوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہولیوں میں ڈانس کر کے کلبوں میں شراب پی کر اور بھیسوں میں چوتا کتھا لگلی لڑکیوں کے ساتھ گھوم کر میں دارالفنون کی مدد کرنا نہیں چاہتا۔ اس سے کہیں زیادہ ولچپ مشاغل مجھے میرے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ مشغلہ کیا برائے کہ میں ہر روز بھی سنٹرل سے گورے گاؤں اور گورے گاؤں سے بھی سنٹرل تک برقی ٹرین میں سینکڑوں وردی پوش فوجیوں کو دیکھتا ہوں جو فتح و نصرت کو اور زیادہ قریب لانے کے لیے شراب کے نشے میں مدد ہو شیا تو انگلیں پسارے سور ہے ہوتے ہیں یا نہایت ہی بد نما عورتوں سے میری موجودگی سے غافل نہایت ہی واہیات قسم کا رومانس لڑانے میں مصروف ہوتے ہیں۔

میں اس جنگ کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا، لیکن جب میرے ہاتھ میں پستول ہو گا اور دل میں یہ دھمکا نہیں رہے گا کہ یہ خود بخود چل پڑے گا تو میں اسے لہراتا ہو باہر نکل جاؤں گا اور اپنے اصلی دشمن کو پہچان کر یا تو ساری گولیاں اس کے سینے میں خالی کر دوں گا۔۔۔۔ یا خود چھٹی ہو جاؤں گا۔ اس موت پر جب میرا کوئی نقادی کہے گا کہ پاگل تھا تو میری روح ان لفظوں ہی کو سب سے بڑا تمغہ سمجھ کر اٹھا لے گی اور اپنے سینے پر آؤ یزاں کر لے گی۔“



اس تقریر یا مضمون پر حکومت پنجاب نے زیر دفعہ ۳۰ ڈیسنس آف انڈیا رولز مقدمہ چالایا۔ الزام یہ ہے کہ اس میں حضور ملک

معظم کی "فورز" کے متعلق ایسی غلط باتیں موجود ہیں جن سے ان کو ضعف پہنچ سکتا ہے۔ "بو" پر جو اس کتاب کا پہلا افسانہ ہے صرف فاشی کا لازم ہے۔

مقدمہ جیسا کہ ظاہر ہے لاہور میں چودھری برکت علی ولد چودھری محمد نقوسا کن لاہور مالک "ادب لطیف" چودھری نذیر احمد ولد چودھری غلام حسین قوم الراعی ساکن لاہور (ایڈیٹر) پیرزادہ احمد ندیم قاسمی ساکن لاہور (ایڈیٹر) سعادت حسن منشولد غلام حسن منش ساکن بمبئی کے خلاف مسٹر بنواری لاال کی عدالت میں پیش ہوا۔

مجھے بمبئی سے بہت ضروری کام چھوڑ کر حاضر ہونا پڑا۔ لاہور پہنچا تو خیال تھا کہ مجھے گرفتار کر لیا جائے گا کیونکہ میرے وارث جاری ہو چکے تھے مگر سب اسپکٹر صاحب نے جن سے اتفاقیہ مکتبہ اردو میں ملاقات ہو گئی، مجھ سے کہا کہ میں صحیح دوسرے ملزہ میں کے ساتھ عدالت میں حاضر ہو جاؤ۔ گورنمنٹ کالج کے بالکل سامنے گرد و غبار میں اٹی ہوئی اپنی اپنیوں کی دو منزلہ عمارت ہے جسے خلیج کہتے ہیں، شاید جگت کے طور پر۔۔۔۔۔ اس عمارت کے ایک کمرے میں ہم سب ملزم پیش ہوئے۔ پہلے میری خانست ہوئی، اس کے بعد کارروائی شروع ہوئی۔ میں اس سے پہلے اس عدالت میں اپنے افسانے "کالی شلوار" کے مقدمے کے سلسلے میں پیش ہو چکا تھا۔ مجسٹریٹ صاحب چنانچہ میری طرف دیکھتے ہی مسکرا دیے۔ استغاثے کی گواہیاں ہوتی رہیں۔ میں خاموش ستارہ، اس لیے کہ سب کی سب لا یعنی بے ہودہ اور منطق و استدلال سے عاری تھیں۔ اسی روز میں نے اپنے وکیل مسٹر ہیرالال سبیل کی معرفت عدالت سے درخواست کی کہ میری حاضری آئندہ پیشیوں میں معاف کر دی جائے۔ عدالت نے یہ درخواست منظور کر لی۔

اتفاق سے ان دنوں میرے بڑے بھائی الحاج محمد حسن منشوبار ایٹ لاء جزا رنجی سے لاہور آئے تھے۔ میں نے ان کو اپنا افسانہ "بو" اور مضمون "ادب جدید" پڑھنے کے لیے دیا اور پوچھا کہ انجام کیا ہو گا۔ دونوں چیزیں بغور پڑھنے کے بعد انہوں نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ استغاثے کی گواہیاں سننے کے بعد ہی مجسٹریٹ مقدمہ خارج کر دے گا۔" لیکن ایسا نہ ہوا۔ میں بمبئی چلا آیا تھا۔ وہاں لاہور میں فرود جرم عائد ہو گیا اور دونوں چودھریوں اور احمد ندیم قاسمی کو صفائی کے گواہ پیش کرنے میں کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑی۔ اسی دوران میں مسٹر بنواری لاال تبدیل ہو گئے اور ان کی جگہ چودھری مہدی علی خان متین ہوئے۔ چونکہ یہ مقدمے کی تفصیل سے بخوبی واقف نہیں تھے اس لیے فیصلہ مرتب کرنے میں کافی دیر ہو گئی۔

۲۵ مئی ۱۹۳۵ء کو چودھری مہدی علی خان نے بال آخر فیصلہ سنادیا۔ صرف اتنا کہا کہ سعادت حسن منشوبری ہے، اس لیے کہ مسٹر بنواری لاال اسے پہلے ہی بری کر چکے تھے۔ میں نے سوچا اگر ایسا ہی تھا تو مجھے بمبئی سے لاہور آنے کی زحمت کیوں دی گئی۔ احمد ندیم بنواری لاال کے پہلے ہی بری کر چکے تھے۔

قائمی بھی بری کر دیئے گئے لیکن دونوں چودھریوں کو سانحہ روپے فی کس کے حساب سے جرمانہ ہوا۔ عدم ادا یتیکی کی صورت میں ایک ایک ماہ قید با مشقت۔ مشقت کا نام سنتے ہی چودھریوں نے جیب میں ہاتھڈا والا اور جرمانہ ادا کر دیا۔

اس کے بعد چودھری مہدی علی خان کے فیصلے کے خلاف مسٹر ایم آر بھائیہ ایڈیشنل نج کی عدالت میں اپیل کی گئی۔ فیصلہ ۲۳ نومبر ۱۹۲۵ء کو ہوا جس کا ترجمہ یہ ہے۔

”زیر نظر مقدمہ وفعہ ۲۹۲ تعزیرات ہند کے تحت ہے جس میں برکت علی اور نذر احمد کو سانحہ روپے جرمانہ اور عدم ادا یتیکی کی صورت میں ایک ماہ قید با مشقت کی سزا کے خلاف مجھ سے اپیل کی گئی ہے۔

ماتحت عدالت فاضل نے اپنے فیصلے میں یہ ریمارک کیا ہے کہ مضمون ”بو“ کا مصنف سوسائٹی کی نظروں میں سخت ترین سزا کا مستحق ہے اور یہ کہ وہی صحیح آدمی تھا جسے قانونی گرفت میں لینا چاہیے تھا مگر پیش رو فاضل نج (مسٹر بنواری لاں) نے اسے بری کر دیا۔ موجودہ ملزموں میں سے ایک پبلشر ہے اور دوسرا ایڈیٹر جس نے مضمون چھاپا۔ قابل غور امر یہ ہے کہ ایسے اشخاص ملزمین کی صفائی میں پیش ہوئے جو اردو زبان کے عالم ہونے کی حیثیت میں بہت مشہور ہیں۔ مثال کے طور پر خان بہادر عبدالرحمٰن چعتائی، مسٹر کے ایل کپور پروفیسر ڈی اے وی کالج، راجندر سنگھ (بیدی) اور ڈاکٹر آئی ایل اطیف پروفیسر ایف سی کالج جو بطور گواہان صفائی پیش ہوئے۔ ان سب کی رائے ہے کہ مضمون ”بو“ میں ایسی کوئی چیز نہیں جو شہوانی حیات پیدا کرے بلکہ ان لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ مضمون ترقی پسند ہے اور اردو ادب کے ماڈرن رہجان سے تعلق رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ استفادہ کے گواہ نمبر چار بیشتر نے بھی دوران جرج میں تسلیم کیا کہ مضمون انسان کے اخلاق پر برا اثر نہیں ڈالتا۔

میری نظر میں مضمون ایک عشقیہ کہانی ہے۔ ایک لڑکے اور لڑکی کی جس میں ایسی بات کا دلچسپ ذکر ہے جو عموماً ہر روز نوجوان آذیزوں میں نہیں ہوتی۔

ماتحت عدالت فاضل نے ہندوستانی نوجوانوں کی قیش پسند زندگی کا ذکر کرتے ہوئے افسوس کیا ہے اور اس پر ماتم کیا ہے کہ ملک میں ہندوستانیوں کا پرانا کیریکٹر تابود ہو رہا ہے۔

ماتحت عدالت کے فاضل نج نے وہ خوبیاں یاد کرائی ہیں جن کے لیے ہم ہندوستانی کبھی مشہور تھے اور نصیحت کی ہے کہ نئے نیکوں کو ختم کر دینا چاہیے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ماتحت عدالت فاضل کے خیالات ترقی پسند نہیں ہیں۔ ہمیں زمانے کے ساتھ ساتھ چلانا ہے۔ حسین چیز ایک

دائیٰ سرت ہے۔ آرٹ جہاں کہیں بھی ملے، ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ آرٹ خواہ وہ تصویر کی صورت میں ہو یا مجھے کی شکل میں سوسائٹی کے لیے قطعی طور پر ایک پیشگش ہے چاہے اس کا موضوع غیر معقول ہی کیوں نہ ہو۔ یہی کلیے تحریروں پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ جب ملک کے مشہور و معروف آرٹسٹوں اور ادیبوں نے ملزمین کے حق میں کہا ہے، سارا فیصلہ یہیں ہو جاتا ہے۔ زیر بحث مضمون ایسا مضمون نہیں کہ جس پر کسی قانونی عدالت میں نکتہ چینی کی جائے۔ میں اپیل کرنے والوں کو بری کرتا ہوں۔“



مجھے چونکہ ”شهادت“ کا رتبہ حاصل نہیں کرنا ہے، اس لیے میں ان تکلیفوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتا جو مجھے لا ہو ر آنے جانے میں اختیار پڑیں۔ ایک لعنت سر سے دور ہو گئی، یہی کافی تھی۔ مجھے ان اخباروں کے متعلق بھی کچھ نہیں کہنا ہے جن میں بھتوں بلکہ مہینوں حکومت اور رعایا کے اخلاقیات کے سبق دیئے جاتے رہے۔ افسوس صرف اتنا ہے کہ یہ پرچے ایسے لوگوں کی ملکیت ہیں جو عضو خاص کی لاغری اور کبھی دور کرنے کے اشتہار خدا اور رسول کی قسمیں کھا کھا کر شائع کرتے ہیں۔ لیکن اپنے ایڈیٹرلوں کی نیز ہمیں بھی ناگوں اور ان کی جگلی ہوئی کروں کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ مجھے ان قلم سے مزدوری کرنے والوں سے دلی ہمدردی ہے۔ ان میں سے اکثر شریف آدمی ہیں جنہیں ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں لیکن چونکہ پرچے چھپنا ہی چاہیے اور اس میں شروع سے لے کر آخر تک کچھ لکھا بھی ہونا چاہیے، اس لیے یہ مجبوراً انسان سیاست، سائنس اور ادب پر جو بھی ان کے ناتربیت یا فتاد ماغوں میں آئے، کاغذ پر گھیث دیتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ صحافت جیسے معزز پیشے پر ایسے لوگوں کا اجارہ ہے جن میں سے اکثر طلاء فروش ہیں۔

پنجاب کی پریس برائج کے متعلق میں ”ایں دفتر بے معنی، نہیں کہہ سکتا“ اس لیے کہ یہ دفتر اپنے معنی و قیاقاً ضرورت کے مطابق نکالتا رہتا ہے۔ چند برسوں سے اس کے معنی یہ ہیں کہ علامہ اقبال مرحوم کے بعد خدائے عز و جل نے ادب کے تمام دروازوں میں تالے ڈال کر ساری چاہیاں ایک نیک بندے کے حوالے کر دی ہیں۔ کاش علامہ مرحوم زندہ ہوتے!

پولیس کی عدالتیں تو خیر پولیس کی عدالتیں ہیں۔ اندھی روح اور گنجے فرشتے۔ اس اندھی روح، گنجے فرشتوں اور پنجاب کے طلاء فروش اخبار والوں اور سالوں کے مالکوں اور ان کے مریض ایڈیٹرلوں کی بدولت ایک بار پھر مجھے لا ہو ر کی عدالت میں حاضر ہونا پڑا جسے جگت کے طور پر ضلع کہتے ہیں۔

اب کا مقدمہ ساتی بک ڈپوڈبلی کی شائع کردہ کتاب ”دھواں“ پر تھا۔ الزام وہی فاشی کا تھا۔ دو افسانے زیر عتاب تھے۔ کتاب کا پہلا افسانہ ”دھواں“ اور ”کالی شلوار“ پر عرصہ ہوا، قانونی پوست مارٹم ہو چکا تھا اور سیشن کورٹ میں یہ فاشی سے مبرأ قرار دی جا چکی۔

تحقی۔ معلوم نہیں ایک بار پھر اس بے ضرر افسانے پر تحریرات ہند کی دفعہ ۲۹۳ کیوں آزمائی گئی۔ اس دفعہ معاملہ کچھ زیادہ سُکنیں معلوم ہوا کیونکہ میرے اور مسٹر شاہد احمد دہلوی (ماں کے ساتی بک ڈپو) کے علاوہ کاتب بھی گرفتار کر لیا گیا جس نے ”دھواں“ لکھنے کے گھناؤ نے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ وہ کتب فروش بھی گرفتار کئے گئے جن کے پاس یہ ملعون کتاب موجود تھی۔ پریس جس میں تجویز تھی اس کا ماں کے بھی دھر لیا گیا۔ میں سلیقے کا بہت قائل ہوں۔ ناگوار سے ناگوار چیز بھی اگر سلیقے کے ساتھ کی جائے تو مجھے ناگوار معلوم نہیں ہوتی۔ لاہوری آئی ڈی کے ایک سب انسپکٹر نے جس کا نام شاید رام سروپ تھا مجھے ۵ دسمبر ۱۹۳۳ء کو گورے گاؤں سے ”ملاڑ“ پولیس اسٹیشن بلوایا اور بغیر وارث دکھائے گرفتار کر لیا۔ میں نے وارث کے متعلق استفسار کیا تو رام سروپ نے کہا۔ ”پرانیویں کاغذات میں تمہیں نہیں دکھا سکتا۔“ یہ حرکت مجھے بری معلوم ہوئی، چنانچہ میں نے شام کو گھر آ کر اپنے سولٹر کو ٹیلیفون کیا جس نے مجھے بتایا کہ میری گرفتاری غیر قانونی ہے، اس لیے حسبِ حکم لاہور کی عدالت میں حاضر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے ایسا ہی کیا لیکن ۸ جنوری ۱۹۳۵ء کو مجھے میرے مکان پر رات کے دس بجے قانونی طور پر گرفتار کر لیا گیا۔ عصمت چختائی (مسٹر شاہد لطیف) کے ساتھ بھی قریب قریب بھی سلوک ہوا۔

۳ فروری ۱۹۳۵ء کے ”قومی جنگ“ (بسمی) میں ”یادب اور تہذیب پر حملہ ہے“ کے عنوان سے ایک مضمون علی سردار جعفری کے قلم سے شائع ہوا جس کی ابتدائی سطور یہ ہے۔

”اردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں سعادت حسن منشو اور عصمت چختائی کے نام بہت مشہور ہیں۔ حال ہی میں منشو کے افسانوں کا ایک نیا مجموعہ ”دھواں“ اور عصمت کے افسانوں کا ایک نیا مجموعہ ”چوٹیں“، دہلی سے شائع ہوا ہے۔ ان مجموعوں میں دونوں افسانہ نگاروں کی بعض بہت اچھی کہانیاں شامل ہیں۔ لیکن معلوم ہوا ہے کہ حکومت پنجاب نے عصمت اور منشو کے بعض افسانوں کو عریاں قرار دیا ہے۔ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ عتاب کون کون سے افسانے پر ہاڑل ہوا ہے، لیکن دونوں کتابیں زدیں ہیں۔ مقدمے کی ساعت ابھی تک شروع نہیں ہوئی ہے۔ ایکشش مجریت کی عدالت میں ۲ فروری کو عصمت اور منشو کی پیشی ہونے والی ہے۔“

لیکن عدالتی کارروائی سے پہلے ہی ان دونوں پر بہت کچھ گزر گئی۔ دسمبر ۱۹۳۳ء کو بسمی کی پولیس نے عصمت چختائی کو بغیر وارث کے گرفتار کر لیا اور ایک ہزار روپے کی خلافت پر رہا کر دیا۔ ۶ دسمبر کو عصمت کو دا اور پولیس کو رٹ میں حاضری دینی پڑی اور انہیں حکم ملا کہ ۶ جنوری ۱۹۳۵ء کو دوبارہ حاضر ہوں۔ جنوری میں پنجاب سے عصمت کا وارث آگیا اور انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ اس مرتبہ دو ہزار روپے کی خلافت دے کر گلوغلاصی ہوئی اور حکم ملا کہ عصمت ۲ فروری کو لاہور کے ایکشش مجریت کیے عدالت میں جا کر حاضری

دیں۔ تقریباً یہی حشر سعادت حسن منتو کا ہوا۔

سعادت حسن منشوکا حشر کچھ زیادہ ہی قابلِ رحم تھا۔۔۔۔۔

مجھے ان دنوں اعصابی درد کی شکایت تھی۔ گھر میں رات کے دس بجے جب مجھے گرفتار کیا گیا تو میں مارے درد کے کراہ رہا تھا۔ پہنچنے پر گرم بوتل تھی لیکن حکم حاکم مرگ مقاجات لاہور حاضر عدالت ہونا ہی پڑا۔

اس دفعہ مقدمہ رائے صاحب لالہ سنت رام ایشیل مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا۔

اک طبقہ سی تجھے!

عدالت میں حاضر ہونے سے پہلے ایک ادیگر عمر کے شریف سے صاحب آئے اور مجھ سے ہاتھ ملا کر کہا۔ ”آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔“

میں نے پوچھا۔ ”آپ کا اسم گرامی؟“

اویز عمر کے شریف صاحب نے جواب دیا۔ ”تاکہ چند ناز“

میں نے اپنا تھکنے کا سچی لیا اور کہا۔ ”معاف کیجئے، مجھے آپ سے مل کر خوشی نہیں ہوئی۔“

لالہ ناک چند ناز استغاثہ کے معزز ترین گواہ تھے جو میرے اور عصمت چنائی دونوں کے خلاف بھجتے۔۔۔۔۔ آپ واقعی بھجتے۔

ایک اور لطیفہ سن لیجئے!

لالرجی نے عصمت کے افسانے "لہاف" کے متعلق کہا کہ اس میں گندے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

ہمارے وکیل مسٹر ہیرالل نے یوچھا۔ ”مثلاً؟“

اللهجي نے ”چونیں“، ”احمالی۔ کافی دیر“ ”الحاد“ کی ورق گروانی کے بعد ایک لفظ تکلای۔ ”عاشق“

ہم سب مکار دیئے۔ مسٹر ہیر الائ نے لالہ بھی سے کہا۔ ”لے لفظ گندے تو آپ اس کی جگہ کوئی دوسرا تجویز کر دیجئے۔“

اللهم جي سوچنے لگے۔

مسٹر ہیر الال نے پوچھا۔ ”یار، کیسار ہے گا؟“

اس دفعہ رائے صاحب لالہ سنت رام بھی مسکرا دیئے۔

جب تک استغاثے کے گواہ پیش ہوتے رہے اسکی مکراہیں جاری رہیں۔ لیکن عدالت برخاست ہونے سے پہلے جب ہمارے وکیل نے درخواست پیش کی کہ مجھے اور عصمت کو آئندہ پیشیوں میں حاضر ہونے سے معاف کر دیا جائے اور جب مجرم یہ صاحب نے اسے مسترد کر دیا تو ہم دونوں کو یہ تکلیف دہ احساس ہوا کہ ہم عدالت میں پیش تھے اور ہم پر غاشی کا شکین جرم عائد تھا۔ مجھے اس کا بھی شدید احساس ہوا کہ سخت سروی ہے اور میں اعصابی درد میں بنتا ہوں۔

عدالت سے باہر مجرم ہیرالال سے مشورہ کیا گیا۔ ایک ہی صورت تھی کہ ہائیکورٹ میں اپیل کی جائے۔۔۔ جو فوراً ہی داخل کر دی گئی۔ دوسرے روز میں اور عصمت آزیبل جسٹس اچھرورام کی عدالت میں پیش ہوئے۔ آپ نے ہم دونوں کو غور سے دیکھا اور کہا۔ ”مجھے آپ دونوں کے افسانے بہت پسند ہیں۔“ ہمیں بہت خوشی ہوئی لیکن انہوں نے اپیل کے کاغذات آزیبل جسٹس دین محمد کی عدالت میں منتقل کر دیئے۔

اب پھر دوسرے روز حاضر ہونا تھا۔ شام کو میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ اتفاق سے میرا بھانجما مجرم عبدالوحید ان دونوں لاہور کے ملٹری ہسپتال میں معین تھا۔ اس نے میرا ایکسرے لیا اور بتایا کہ مجھے ہائیکورٹ نیو موٹھور بیکس ہے۔ یعنی میرے داہنے پھیپھڑے کے ایک حصے میں پانی اور ہوا داخل ہوئی ہے۔

میر وحید کے کہنے پر میں نے دوسرے روز صح سویرے کریں امیر چند سے بھی تشخیص کرائی۔ انہوں نے وہی مرغ بتایا اور رائے دی کہ مجھے آرام کرنا چاہیے۔ میں نے ان سے سرٹیفیکیٹ لے لیا کہ شاید کام آجائے داشتہ آید بکار۔

دوسرے روز آزیبل جسٹس دین محمد کی عدالت میں پیش ہوا۔ عصمت غیر حاضر تھیں۔ جسٹس دین محمد صاحب نے قبرآلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بڑیڑائے۔ ”ان لوگوں کا وجود ننگ ادب ہے۔“ مجھے ایسا لگا جیسے میری قسمت پر مہر لگا دی گئی ہے۔ انہوں اپیل منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن جب میں نے اپنے وکیل سے کریں امیر چند کا سرٹیفیکیٹ پیش کرنے کے لیے کہا تو اپیل ایک قبرآلود سختخط سے منظور کر دی۔ میں بسمی و اپس چلا آیا۔

بسمی میں بہت دیر تک ڈاکٹروں میں یہ بحث ہوتی رہی کہ میرا مرد کی تشخیص کہتی تھی کہ مجھے ”ہائیکورٹ نیو موٹھور بیکس“ ہے لیکن ڈاکٹر لیملا اور ڈاکٹر ایف ڈبلیو بر جر (یا بر گر) کی ایکسرے دیکھنے کے بعد یہ رائے تھی کہ صرف ”نیو موٹھور بیکس“ ہے۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ ڈاکٹر ایف ڈبلیو بر جر (یا بر گر) کو خط لکھا۔ پرانا ایکسرے دیکھنے اور نیا امتحان لینے کے بعد ڈاکٹر ایف ڈبلیو بر جر (یا بر گر) کو خط لکھا۔

"مریض اس وقت نارمل حالت میں ہے۔ نیومو تھورنکس اور سیال مادہ بالکل غائب ہے۔ یہ کیس جیسا کہ ظاہر ہے پانچیں "نیومو تھورنکس" کی قبیل سے تھا، ایسے چند کیس بعض اوقات "کوئ خ" میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔"

اس "کوئ خ" کا مطلب مجھے لاہور میں میجر وحید نے بتایا جب میں اس مقدمے کا فیصلہ سننے کے لیے گیا۔ مطلب یہ تھا کہ ایسے چند کیس بعض اوقات دق میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ لیکن دق اور زرع میں اس وقت ہو اجنب میں نے صفائی کے گواہوں کی فہرست تیار کی اور رائے صاحب الامت رام نے ان کی گواہی بذریعہ کمیشن لینے سے انکار کر دیا۔ کوئی گواہ حیدر آباد میں تھا، کوئی لاکھنؤ میں اور کوئی بسمی میں۔ لیکن رائے صاحب مصر تھے کہ سب کے سب لاہور میں حاضر ہوں۔ مکرمی نیاز فتح پوری صاحب کو جب لاکھنؤ میں اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے لکھا۔ "یقیناً کمیشن کے ذریعہ شہادت قلمبند ہو سکتی تھی اور اس میں بڑی آسانی تھی۔ تجربہ ہے مجریہ نے اسے منظور نہیں کیا اور آپ کے مشیر قانون نے کیوں اس پر زور نہ دیا۔"

مجھے معلوم نہیں مشریعہ الال نے اس پر زور دیا تھا نہیں، بہر حال رائے صاحب الامت رام کا فیصلہ اُن تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر "بیام" حیدر آباد لیٹھنینٹ کریم قریشی (آلی ایم ایس بسمی) نیاز فتح پوری صاحب ایڈیٹر "نگار" لاکھنؤ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب ایم اے ایل ایل بی پی اسچ ڈی (پرنسپل) امر شکھ کالج سری نگر، مشریعہ ندرا نا تھے چنٹو پا دھیا ہے بسمی جسے اُن الرائے صاحبان کے خیالات سے نہ صرف میں بلکہ عدالت بھی محروم رہی۔

میں نے ان گواہی کی دعوت ان الفاظ میں دی تھی۔



بسمی: ۳۰ ستمبر

مکرمی!

تسلیمات، لاہور کی عدالت میں میرے ایک افسانے "دھواں" پر فاشی کا الزام میں مقدمہ چل رہا ہے۔ میں نے آپ کو گواہ صفائی کے طور پر بلا یا ہے۔ متذکرہ صدر افسانے کے بارے میں آپ کی جو رائے بھی ہو، مجھے منظور ہو گی، اس لیے فاشی اور غیر فاشی کے اہم موضوع پر آپ جیسے اُن الرائے ادیب اور صاحب قلم کے خیالات نہ صرف میرے لیے بلکہ ملکی ادب کے لیے مفید ہوں گے۔

مجھے امید ہے کہ آپ میری یہ دعوت قبول فرمائیں گے۔ شکریا!

(نیاز کیش۔۔۔۔۔ سعادت حسن مندو)



سب نے میری دعوت قبول کی جس کے لیے میں شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سیکرٹری "انجمن ترقی اردو" ہندے میرے عربیت کا جواب نہ دیا۔ بہت ممکن ہے ان تک پہنچا ہی نہ ہو۔ سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" کی طرف سے جب مجھے کوئی رسیدن آئی تو مجھے بہت غصہ آیا۔ کیونکہ مجھے ان کی دوستی پر ناز ہے۔ میں نے پھر ان کو لکھا جواب آیا۔

"آپ کا دوسرا خط مل، میرا داخلہ پنجاب میں بند ہے اس لیے شہادت کیسے دوں۔ یہی میں نے سن پر لکھ دیا تھا۔ اگر مجریت پنجاب گورنمنٹ سے اجازت لے لے میں توجانے کے لیے تیار ہوں۔"

ایک اور لطیفہ سنئے!

بسمی سے میں نے لاہور میں پروفیسر موہن سنگھ دیوانہ کو گواہی دینے کے لیے لکھا۔ سن ان کے پاس پہلے پہنچ چکے تھے۔ میرا خط انہیں دیر کے بعد مل، چنانچہ انہوں نے ایک کارڈ لکھا۔

حضرت سلامت!

آپ کے وکیل سے ایک مرتبہ پہلے میری ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے نہ مقدمے کی وجہ بیان کی نہ یہ کہا کہ کس افسانے پر دھرے ہوئے ہو۔ چار کوپیشی تھی۔ دس بجے حاضر عدالت ہوا۔ سوا بارہ بجے تک دھوپ میں سزاوار ہا۔ ٹانگوں کو مسلتا اور بلغم نکالتا رہا۔ نہ جائے نشتن نہ اذن رفت۔ سوا بارہ بجے بلوایا گیا۔ "کیوں جی، وہ کہانیاں تم نے پڑھی ہیں؟" ----- "حضور نہیں!" ----- "حضور کے ارشادات موجود تھے۔ میرا قصور یہ ہے کہ میں بے قصور ہوں۔ آپ خفافہ ہوں گے کہ ایک ہم پیشہ "قلم مار" نے یہ کیا حرکت کی۔ میں خفا ہوں کہ وکیل ست، مولک ست تو۔----- منشو کوستی کی بیماری ہو، یقین نہیں آتا۔

اور مجھے یہ یقین نہیں آتا کہ پروفیسر موہن سنگھ دیوانہ نے میری کہانیاں پڑھی ہی نہیں تھیں۔ غلطی مجھ سے بھی ہوئی کہ میں نے "بڑے پیکٹ والے لفافے" یعنی اس وقت بھیجے جب کہ سن جاری چکے تھے۔ ان لفافوں میں، میں نے اپنے اس تحریری بیان کی لفظ بھیجی تھی جو میں نے عدالت میں دیا تھا۔ چونکہ اس بیان کا میری تحریروں سے گہر اعلق ہے اس لیے میں اسے ذیل میں لفظ کرتا ہوں۔

"میں ساتی بک ڈپوڈیلی کی مطبوعہ کتاب بعنوان "دھواں" کا مصنف ہوں۔ یہ کتاب میں نے ۱۹۳۱ء میں جکہ میں آل انڈیا ریڈی یو ڈیلی میں ملازم تھا، ساتی بک ڈپو کے مالک میاں شاہد احمد دہلوی کو غالباً تین یا ساڑھے تین سوروپے میں فروخت کی تھی۔ اس

کے جملہ حقوق اشاعت اب ساتی کبڈپوکے پاس ہیں۔

اس کتاب کے جو نئے میں نے عدالت میں دیکھے ہیں ان کے ملاحظے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔

چونکہ افسانوں کے اس مجموعے میں جوانسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق ہیں، دو افسانے بعنوان "دھوواں" اور "کالی شلوار" استغاثے کے نزدیک عریاں اور نجاشیں ہیں۔ مجھے اس سے اختلاف ہے کیونکہ یہ دونوں کہانیاں عریاں اور نجاشیں ہیں۔

کسی ادب کے متعلق ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر ایک اشتہار فراہم کرنے والے اور ایک سرکاری مترجم کا فیصلہ صائب نہیں ہو سکتا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ تینوں کسی خاص اثر، کسی خاص غرض کے تحت اپنی رائے قائم کر رہے ہوں اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ تینوں حضرات ایسی رائے دینے کے اہل ہی نہ ہوں کیونکہ کسی بڑے شاعر کسی بڑے افسانہ نگار کے افسانوں پر صرف وہی آدمی تنقید کر سکتا ہے جو تنقید نگاری کے فن کے تمام عوائق و عوامل سے آگاہ ہو۔

استغاثے نے میرے ان دو افسانوں پر کوئی بصیرت افروز تنقید نہیں کی۔ صرف اتنا کہہ دینے سے کہ یہ دونوں افسانے نجاشیں ہیں، اس آدمی کی جور و شنی کا خواہشمند ہے، جو اپنے عیوب و محاسن جاننا چاہتا ہے اور ان کی اصلاح کرنا چاہتا ہے ہرگز ہرگز تسلیم نہیں ہوتی۔ میں اگر جواب میں صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو جاؤں کہ دونوں افسانے نجاشیں ہیں تو ظاہر ہے کہ میں اندر ہرے میں اور بھی اضافہ کر دوں گا۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گا اور جہاں تک مجھے ہو سکے اپنا مافی الصیر بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

زبان میں بہت کم لفظ نجاشیں ہوتے ہیں۔ طریق استعمال ہی ایک ایسی چیز ہے جو پاکیزہ الفاظ کو بھی نجاشیں بنا دتا ہے۔ میرا خیال ہے کوئی بھی چیز نجاشیں نہیں۔ لیکن گھر کی کرسی اور ہانڈی بھی نجاشیں ہو سکتی ہے اگر ان کو نجاشی طریقے سے پیش کیا جائے۔ چیزیں نجاشیں بنائی جاتی ہیں، کسی خاص غرض کے ماتحت۔

عورت اور مرد کا رشتہ نجاشیں نہیں، اس کا ذکر بھی نجاشیں نہیں، لیکن جب اس رشتے کو چوراہی آسنوں یا جوڑدار خفیہ تصویروں میں تبدیل کر دیا جائے اور لوگوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ تحفے میں اس رشتے کو غلط زاویے سے دیکھیں تو میں اس فعل کو صرف نجاشی نہیں بلکہ نہایت گھنا و نتا، مکروہ اور غیر صحیت مند کہوں گا۔ نجاشیں اور غیر نجاشیں میں تمیز کرنے کے لیے شاید مثال کام دے سکے۔

ایک آرٹ گیلری میں نمائش کے لیے نگرانی عورتوں کی بہت سی تصویریں پیش ہوئیں۔ ان میں سے کسی نے بھی جیسا کہ ظاہر ہے دیکھنے والوں کا اخلاقی خراب نہ کیا اور نہ ان کے شہوانی جذبات کو بھارا۔ البتہ ایک تصویر جس میں عورت کا سارا بدن کپڑوں میں مستور تھا اور ایک خاص حصہ اس ترکیب سے نیم عریاں چھوڑ دیا گیا کہ دیکھنے والوں کے جذبات میں گدگدی ہی ہوتی تھی، نجاشیں قرار دی گئی۔

کیوں۔۔۔ اس لیے کہ آرٹسٹ کی نیت میں فرق تھا اور اس نے جان بوجھ کر لباس کو کچھ اس طرح اوپر اٹھا دیا تھا کہ دیکھنے والوں کے دل و دماغ میں ہچل لی گئی اور وہ اپنے تصور سے مدد لے کر اس نیم عربیاں حصے کو عربیاں دیکھنے کی کوشش کریں۔ تحریر و تقریر میں، شعرو شاعری میں، سنگ سازی و صنم تراشی میں غاشی تلاش کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کی ترغیب میلوںی چاہیے۔ اگر یہ ترغیب موجود ہے، اگر اس کی نیت کا ایک شاید بھی نظر آ رہا ہے تو وہ تحریر و تقریر وہ شعر وہ بت، قطعی طور پر فخش ہے۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ ترغیب ”دھوان“ میں موجود ہے یا نہیں۔۔۔ آئیے! ہم افسانے کا تجزیہ کرتے ہیں۔ مسعود ایک کم سن لڑکا ہے غالباً دس بارہ برس کا۔۔۔ اس کے جسم میں جنسی بیداری کی پہلی لہر کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس افسانے کا موضوع ہے۔ ایک خاص فضा اور چند خاص چیزوں کا اثر بیان کیا گیا ہے جو مسعود کے جسم میں وہندے وہندے خیالات پیدا کرتا ہے۔ ایسے خیالات جن کا رجحان جنسی بیداری کی طرف ہے۔ یہ بیداری وہ سمجھنیں سکتا ہیں لیکن نیم شعوری طور پر محسوس ضرور کرتا ہے۔ بے کھال کا بکرا جس میں سے دھوان انتہا ہے۔ سرد یوں کا ایک دن جب کہ باول گھرے ہوتے ہیں اور آدمی سردی کے باوجود ایک میٹھی میٹھی حرارت محسوس کرتا ہے۔ ہانڈی جس میں سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ بہن، جس کی نانگیں وہ دباتا ہے۔۔۔ یہ سب عناصر مل کر مسعود کے بدن میں جنسی بیداری پیدا کرتے ہیں۔ جوانی کی اس پہلی انگڑائی کو وہ غریب سمجھنیں سکتا ہے اور انجام کا راپنی ہا کی اسک توڑنے کی ناکام سعی کرتا کرتا تھک جاتا ہے۔ یہ تھکا وٹ اس بے نام ہی چنگاری کو ”اس“ کچھ کرنے کی تحریک کو دیا دیتی ہے۔

”دھوان“ میں شروع سے لے کر آخر تک ایک کیفیت، ایک جذبے، ایک تحریک کا نہایت ہی ہموار نفیا تی بیان ہے۔ اصل موضوع سے ہٹ کر اس میں دور از کار باتیں نہیں کی گیں۔ اس میں ہمیں کہیں بھی ایسی ترغیب نظر نہیں آتی جو قارئین کو شہوائی لذتوں کے دائرے میں لے جائے اس لیے کہ افسانے کا موضوع ”شہوت“ نہیں ہے۔ استغاثہ اگر ایسا سمجھتا ہے تو اس کی کم نظری ہے۔ خشاش کے دانے افیم کی گولی بننے تک کافی مرحلے کرتے ہیں۔

میں نے اس کہانی میں کوئی سبق نہیں دیا۔ اخلاقیات پر یہ کوئی یقین بھی نہیں کیوں کہ میں خود کو نام نہادنا صحیح یا معلم اخلاق نہیں سمجھتا۔ البتہ اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ اس لڑکے کو مضطرب کرنے والی چیزیں خارجی تھیں۔ انسان اپنے اندر کوئی برائی لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ خوبیاں اور برا نیاں اس کے دل و دماغ میں باہر سے داخل ہوتی ہیں۔ بعض ان کی پروپریٹیز کرتے ہیں، بعض نہیں کرتے۔ میرے نزدیک قصاصیوں کی دکانیں فخش ہیں کیونکہ ان میں نگئے گوشت کی بہت بد نما اور کھلے طور پر نمائش کی جاتی ہے۔ میرے نزدیک وہ باپ

اپنی اولاد کو جنسی بیداری کا موقع دیتے ہیں جو دن کو بند کر دوں میں کئی کئی گھنٹے اپنی بیوی سے سرد یوانے کا بہانہ لگا کر اس سے ہم بستری کرتے ہیں۔

ہندوستان میں بچوں کے اندر بہت کم سنی ہی میں جنسی بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ کسی حد تک آپ کو میرے افسانے کے مطالعے سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اتنی چھوٹی عمر میں جنسی بیداری کا پیدا ہونا میرے نزدیک بہت ہی بخوبی چیز ہے۔ یعنی اگر میں کسی چھوٹے بچے کو جنسیات کی طرف راغب دیکھوں تو مجھے کوفت ہو گی۔ میرے صناعات جذبات کو صدمہ پہنچے گا۔

افسانہ نگار اس وقت اپنا قلم اٹھاتا ہے جب اس کے جذبات کو صدمہ پہنچتا ہے۔ مجھے یاد نہیں کیوں کہ عرصہ گزر چکا ہے لیکن ”دھواں“ لکھنے سے پہلے مجھے کوئی منظر کوئی اشارہ یا کوئی واقعہ یکھ کر ضرور ایسا صدمہ پہنچا ہو گا جو افسانہ نگار کے قلم کو حرکت بخشدے ہے۔ افسانے کا مطالعہ کرنے سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو سکتا ہے کہ میں نے اس بے نامی لذت میں جو مسعود کو محسوس ہو رہی تھی، خود کو یا قارئین کو کہیں شریک نہیں کیا۔ یہ ایک اچھے فنکار کے قلم کی خوبی ہے۔ اس افسانے میں سے چند سطور پیش کرتا ہوں جس سے افسانہ نگار کے غایت درج محتاط ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے کہیں بھی مسعود کے دماغ میں شہوانی خیالات کی موجودگی کا ذکر نہیں کیا۔ ایسی لغزش افسانے کا ستیاناں کرو دیتی۔

(۱) مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کر میں خفیف سا جھکا و پیدا ہو گیا۔ جب اس نے بیرون سے دبانا شروع کیا شیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں۔ کلثوم نے مرا لینے کی خاطر ہولے ہولے ”ہائے ہائے“ کرنا شروع کیا۔

(۲) کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے بیرون کے نیچے دب دب کر اوہر اوہر پھسلنے لگیں۔ مسعود نے ایک بار اسکوں میں تنہ ہوئے رے سے پر ایک بازی گر کو چلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ باز گر کے بیرون کے نیچے تنہ ہوار سا اسی طرح پھسلتا ہو گا۔

(۳) بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے سوچا ”کلثوم کو اگر ذبح کیا جائے تو کھال اتر جانے پر کیا اس کے گوشت میں سے بھی دھواں لٹکے گا؟“ ..... لیکن ایسی بے ہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا جیسے وہ سلیٹ کو اسٹنچ سے صاف کیا کرتا تھا۔

خط کشیدہ الفاظ اس بات کے ضمن میں کہ مسعود کا ذہن کہیں بھی شہوت سے ملوث نہیں ہوا۔ وہ اپنی بہن کی کردا تھا ہے جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں۔ نائلیں دباتا ہے تو اس کا خیال بازی گر کی طرف چلا جاتا ہے جس کا تماشا اس نے ایک بار اپنے سکول

میں دیکھا تھا۔ اور جب یہ سوچتا ہے کہ اس کی بہن ذبح کر دی جائے تو کیا اس کے گوشت میں سے دھواں لٹکے گا تو فوراً اسے بری بات سمجھ کر اپنے دماغ سے نکال دیتا ہے اور خود کو مجرم سمجھتا ہے۔

خدا جانے استغاش اس افسانے کو فرش کیوں کہتا ہے، جس میں فاشی کا شایہ تک موجود نہیں۔ اگر میں کسی عورت کے سینے کا ذکر کرنا چاہوں گا تو اسے عورت کا سینہ ہی کہوں گا۔ عورت کی چھاتیوں کو آپ موٹگ پھلی، میز یا استرانیں کہہ سکتے۔ یوں تو بعض حضرات کے نزد یہک عورت کا وجود ہی فرش ہے۔۔۔۔۔ مگر اس کا کیا اعلان ہو سکتا ہے۔

میں ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جن کو بکری کا ایک مخصوص بچپنی معصیت کی طرف لے جاتا ہے۔۔۔۔۔ دنیا میں ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جو مقدس کتابوں سے شہوانی لذت حاصل کرتے ہیں۔ اور ایسے انسان بھی آپ کو مل جائیں گے، لوہے کی مشینیں جن کے جسم میں شہوت کی حرارت پیدا کر دیتی ہیں۔ مگر لوہے کی ان مشینوں کا جیسا کہ آپ سمجھ سکتے ہیں، کوئی قصور نہیں۔ اسی طرح نہ بکری کے مخصوص بچے کا اور نہ مقدس کتابوں کا۔

ایک مریض جسم ایک بیمار ذہن ہی ایسا غلط اثر لے سکتا ہے۔ جو لوگ روحانی، ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تندروست ہیں، اصل میں انہی کے لیے شاعر شعر کہتا ہے افسانہ نگار افسانہ لکھتا ہے اور مصور تصویر بناتا ہے۔

میرے افسانے نے تندروست اور صحت مندوگوں کے لیے ہیں ایسے انسانوں کے لیے جو عورت کے سینے کو عورت کا سینہ ہی سمجھتے ہیں اور اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھتے۔ جو عورت اور مرد کے رشتے کو استھاپ کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ جو کسی ادب پارے کو ایک ہی وفعہ نگل نہیں جاتے۔

روشنی کھانے کے متعلق ایک موٹا سا اصول ہے کہ ہر لمحہ اچھی طرح چبا کر کھاؤ، لعاب دہن میں اسے خوب حل ہونے دوتا کر معدے پر زیادہ بو جھنے پڑے اور اس کی غذا ایسیت برقرار رہے۔ پڑھنے کے لیے بھی یہی موٹا اصول ہے کہ ہر لمحہ کو ہر سطر کو ہر خیال کو اچھی طرح ذہن میں چباو۔ اس لعاب کو جو پڑھنے سے تمہارے دماغ میں پیدا ہوگا، اچھی طرح حل کروتا کر جو کچھ تم نے پڑھا ہے، اچھی طرح ہضم ہو سکے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کے نتائج بڑے ہوں گے جس کے لیے تم لکھنے والے کو ذمہ دار نہ تھا اسکو گے۔ وہ روشنی جو اچھی طرح چبا کرنہیں کھانی گئی تمہاری بدھضمی کی ذمہ کیسے ہو سکتی ہے۔

میں ایک مثال سے اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ فرانس میں ایک بہت بڑا افسانہ نگار گاہی دی موپاسان گزارا ہے۔ جنیات اس کا محبوب موضوع تھا۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں اور ماہرین نفیات نے اس کے افسانوں کا اپنی علمی کتابوں میں حوالہ دیا ہے۔ اپنے

ایک افسانے میں وہ ایک لڑکے اور لڑکی کی داستان بیان کرتا ہے جو بے حد الہر تھے۔ پہلی رات کے متعلق دونوں نے سنبھالی باتوں سے ایک عجیب و غریب تصویر اپنے ذہن میں کھینچ کر گئی تھی۔ دونوں اس خیال سے کپکار ہے تھے کہ خدا معلوم کتنی بڑی لذت ان کو پہلی رات کے ملاپ سے ملے گی۔

دونوں کی شادی ہو گئی۔ دولہا "ما عسل" منانے کی خاطر دہن کو ایک ہوٹل میں لے گیا۔ وہاں پہلی رات کو۔۔۔۔۔ اس رات کو جس میں دونوں کے خیال کے مطابق شاید فرشتے اتر کر ان کو لوریاں دینے والے تھے، دولہا اور دہن، ہم بستر ہو گئے۔۔۔۔۔ دونوں لیٹئے تھے اور بس۔۔۔۔۔ دہن نے شامت اعمال سے اتنا کہہ دیا۔ "بس۔۔۔۔۔ کیا یہی ہماری رات تھی جس کے ہم دونوں اتنے شیریں خواب دیکھا کرتے تھے۔" دولہا کو یہ بات کھا گئی، آخر مرد ہی تو تھا۔ اس نے سوچا یہ میری مرد انگلی پر حملہ ہے۔۔۔۔۔ چنانچہ اس کی مرد انگلی بالکل ہی ختم ہو گئی۔۔۔۔۔ عرق ندامت میں غرق وہ جملہ عروی سے باہر نکل گیا، اس غرض سے کہ اپنی ناکام زندگی کسی دریا کے پسرو کر دے۔ میں اس وقت جب یہ نیا نویلا دولہا اس خطرناک فیصلے پر پہنچا، فرانس کی ایک کسی ایک ویشاپا سے گزری جو غالباً گاپک طلاش کر رہی تھی۔ اس عصمت بانخت عورت نے اس کو اشارہ کیا۔ دولہا نے محض انتقام لینے کے لیے۔۔۔۔۔ ساری عورت ذات سے بدلمہ لینے کے لیے اس کو اس اشارے کا جواب دیا کہ ہاں میں تیار ہوں۔ وہ نکھیائی اسے اپنے گھر لے گئی۔ اس کے غلیظ گھر میں دولہا وہ کام کرنے میں کامیاب ہو گیا جو وہ اپنے نیس ہوٹل کے جملہ عروی میں نہ کر سکتا۔۔۔۔۔ اب وہ اس ویشاپا کو بھول گیا۔۔۔۔۔ دوڑا دوڑا اپنی نئی بیاتا بیوی کے پاس پہنچا جیسے اسے کھوئی ہوئی دولت مل گئی ہے۔۔۔۔۔ دونوں پاس پاس لیٹے تھے مگر اب اس کی بیوی کو وہ شیریں خواب دیکھنے کی خواہش باقی نہیں رہی تھی جس کا اس نے پہلے گلہ کیا تھا۔

یہ افسانہ پڑھ کر اگر کوئی شخص جو پہلی رات ناکام رہا ہو سیدھا ویشاپا کے کوٹھے کارخ کرے تو میں سمجھتا ہوں اس جیسا چغدا اور کوئی نہیں ہوگا۔ میرے ایک دوست نے یہی بیوقوفی کی اور اس کا نتیجہ یہ تکلا کہ اسے اپنا کھویا ہوا وقار تول گیا پر اس کے ساتھ ہی ایک مکروہ مرض چھٹ گیا جس کے علاج کے لیے اسے کافی زحمت اٹھانا پڑی۔

پچھلے دونوں میں نے آں انڈیا ریڈ یونیورسٹی سے ایک تفریر تشریکی تھی۔ اس میں میں نے کہا تھا۔

"اوہ ایک فرد کی اپنی زندگی کی تصویر نہیں۔ جب کوئی اویب قلم اٹھاتا ہے تو وہ اپنے گھر یا معاشرات کا روز نامچہ پیش نہیں کرتا۔ اپنی ذاتی خواہشوں، خوشیوں، رنجشوں، بیماریوں اور تندرستیوں کا ذکر نہیں کرتا۔ اس کی قلمی تصویر وہ میں بہت ممکن ہے آنسو اس کی دلکھی

بہن کے ہوں، مسکراہیں آپ کی ہوں اور قبیلے ایک خست حال مزدور کے۔ اس لیے اپنی مسکراہوں اپنے آنسوؤں اور اپنے قبھوں کی ترازو میں ان تصویروں کو تو نا بہت بڑی قلطی ہے۔ ہر ادب پارہ ایک خاص فضا ایک خاص اثر ایک خاص مقصد کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس میں یہ خاص اثر اور یہ خاص مقصد محسوس نہ کیا جائے تو یہ ایک بے جان لاش رہ جائے گی۔“

میں ایک زمانے سے لکھ رہا ہوں۔ گیارہ کتابوں کا مصنف و مولف ہوں۔ آل انڈیا ریڈیو کے تقریباً ہر ایشیان سے میرے ذرا سے اور فچر براد کاست ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی تعداد سو سے اوپر ہے۔ میں تحریر و تصنیف کے جملہ آداب سے واقف ہوں۔ میرے قلم سے بے ادبی شاذ و نادری ہو سکتی ہے۔ میں فخش نگار نہیں، افسانہ نگار ہوں۔

دوسرے افسانے ”کالی شلوار“ کے متعلق میں نے اس لیے کچھ نہیں کہا کہ لاہور کی سیشن کورٹ میں اسے فاشی سے بری قرار دیا جا چکا ہے۔“

میرے اس بیان کا کچھ اثر نہ ہوا۔ صفائی کے گواہوں میں ڈاکٹر سعید اللہ ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی ڈی ایم سی، پروفیسر سہیلاں لال پکور، ایم اے، ایل ایل بی، ڈاکٹر آئی لطیف ایم اے، پی ایچ ڈی مولانا باری علیگ، دیوندر ستیار تھی جیسے اہل الرائے ہستیاں موجود تھیں۔ ان حضرات نے اپنا قیمتی وقت ضائع کر کے سارا سارا دون عدالت میں گزار کر میرے حق میں گواہی دی اور کہا کہ زیر عتاب افسانوں میں فاشی کا شایب بھی موجود نہیں۔ لیکن رائے صاحب لالہ سنت رام نے دونوں افسانے فخش قرار دیئے اور مجھے دوسو رو پہیہ جرمات ادا کرنے کی سزا دی۔ عدم ادائیگی جرمات کی صورت میں کتنے مہینوں کی قید با مشقت تھی، تھی یا نہیں، اس کا مجھے علم نہیں۔ میں نے جب اپنی جیب سے دوسرو پہ نکالے تو ایک مسکراہت صاحب کے ہونٹوں پر ایک ایک مسکراہت شمودار ہوئی۔ آپ نے کہا۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کیل کائنے سے لمبی ہو کر آئے تھے۔“

باؤ جو دو کوش کے میرے ہونٹوں پر ایک مسکراہت پیدا نہ ہو سکی۔ سیشن میں اپیل کی گئی۔ پیروی مسٹر ہیر الال سبیل نے کی۔ کئی مہینے گزرنے پر ایک روز ان کا تار آیا کہ مبارک ہو، سیشن کورٹ نے اپیل منظور کر لی۔ جرمات واپس ہو جائے گا۔

تیسرا دفعہ انجام بخیر ہوا۔

ایک اور لطیفہ سنئے۔-----

چند روز ہوئے، ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے تو کرسے کہا۔ ”پوچھو، کون ہے؟“

جواب آیا۔ ”سی آئی ڈی کا آدمی“

ظاہر ہے کہ لاہور سے گرفتاری کا وارث تھا لیکن جب میں اس سی آئی ڈی کے آدمی سے ملا اور اس سے کہا۔ ”فرمائیے! اب کی میری کس کہانی پر عتاب نازل ہوا ہے۔“

یہ سن کر مجھے تسلی ہوئی اور مذاق سو جھا۔ ”چوپڑی سے، کیونٹ پارٹی سے؟“

”کیونٹ یارٹی سے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”تعلق سے، مگر تناہی از،“

۱۰۷

”اس لیے کہ تمہاری حکومت یہی بھجھتی ہے۔ ورنہ تم یہاں تپاس کرنے کیوں آتے؟“  
یہ قصہ بھی ختم ہوا۔

آخر میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے لاہور کی ایسی عدالت میں جہاں شریف انسانوں کو بیٹھنے کے لیے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی بھی نہیں ملتی، جنہوں اپنا قسمتی وقت شائع کر کے بھینیوں کے آگے گئیں بھجائی۔

مسٹر اے ایس بخاری کا بھی ممنون و تسلکر ہوں۔ مذکورہ صدر مقدمے کے بعد یا اس سے کچھ دیر پہلے، آپ نے بھی ریڈ یو اسٹیشن میں مجھے بلا یا اور بڑی شفقت سے بتایا کہ وہ اور ڈاکٹر محمد دین تاشیر میرے اور عصمت کے عتاب زدہ افسانوں کے متعلق ہندوستان کے مشہور ادیبوں کی رائے مرتب کرنے والے ہیں اور یہ کہ انہوں نے لاہور میں عدالت سے بیانات وغیرہ کی نقل لینے کے لیے ایک آدمی بھی معین کر دیا ہے۔

یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے اتفاق سے میرا افسانہ نہیں پڑھاتا تھا، چنانچہ ان کے ارشاد کے مطابق ایک جلد اس کتاب کی ان کو دہلی روائت کرو دی۔ اس ملاقات کو تقریباً ایک برس ہو جکائے، امید سے بخاری صاحب نے اپنا کام ختم کر لیا ہوگا۔

۱۱۷



## بو

برسات کے سیلی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر چپل کے پتے اسی طرح نہار ہے تھے۔ ساگوان کے اس پر گلوں والے پنگ پر جواب کھڑکی کے پاس سے ذرا ادھر کو سر کادیا گیا تھا۔ ایک گھاٹن اونڈیا نہیں کرتے۔ اس کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔

کھڑکی کے باہر چپل کے پتے رات کے دو دھیا لے اندھیرے میں جھمکوں کی طرح تھر تھر ار ہے تھے اور نہار ہے تھے اور وہ گھاٹن اونڈیا نہیں کرتے۔ بن کر چمٹی تھی۔ وہ شام کے قریب دن بھر ایک انگریزی اخبار کی تمام خبریں اور اشتہار پڑھنے کے بعد جب وہ بالکنی میں ذرا تفریح کی خاطر آ کھڑا ہوا تھا تو اس نے گھاٹن لڑکی کو جو غالباً ساتھ وालے رسیوں کے کارخانے میں کام کرتی تھی اور بارش سے بچنے کے لیے اعلیٰ کے درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ کھانس کھنکار کر اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور آخر میں ہاتھ کے اشارے سے اسے اوپر بلا لایا تھا۔

وہ کئی دنوں سے شدید قسم کی تہائی محسوس کر رہا تھا جنگ کے باعث بھی کی قریب قریب تمام کرچھین چھو کر یاں جو پہلے سے داموں پر مل جاتی تھیں۔ عورتوں کی اگز اری فورس میں بھرتی ہو گئی تھیں۔ ان میں بعض نے فورٹ کے علاقے میں ڈانگ سکول کھول لئے تھے۔ جہاں صرف فوجی گوروں کو جانے کی اجازت تھی۔ رندھر بہت اداس ہو گیا تھا۔ اس کی اداسی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کرچھین چھو کر یاں نایاب ہو گئی تھیں۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ رندھر جو فوجی گوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہذب، تعلیم یافتہ صحت مند اور خوبصورت تھا۔ صرف اس لئے اس پر فورٹ کے اکثر قبہ خانوں کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے کہ اس کی چجزی سفید نہیں تھی۔

جنگ سے پہلے رندھر ناگپڑا اور تاج ہوٹل کے گرد نواح کی کئی کرچھین لڑکیوں سے جسمانی ملاقات کر چکا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایسی ملاقات کے آداب سے وہ ان کرچھین اونڈوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ واقفیت رکھتا ہے جن سے یہ لڑکیاں فیشن کے طور پر رومانس لرا تی جیں اور بعد میں کسی چند سے شادی کر لیتی جیں۔

رندھر نے محض دل ہی دل میں ہیزیل سے اس کی تازہ تازہ پیدا اشدہ رعونت کا بدالہ لینے کی خاطر اس گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلا یا تھا۔ ہیزیل اس کے فیٹ کے نیچے رہتی تھی اور ہر روز صبح کو دردی پہن کر اور اپنے کشے ہوئے بالوں پر خاکی رنگ کی ٹوپی ترچھے

زاویے پر جا کر باہر نکلی تھی اور اس انداز سے چلتی تھی گویا فٹ پا تھے پر تمام جانے والے اس کے قدموں کے آگے ٹائٹ کی طرح بچھتے چلے جائیں گے۔

رندھیر نے سوچا تھا کہ آخر وہ کیوں ان کرچکھن چھوکریوں کی طرف اتنا راغب ہے اس میں کوئی شک نہیں وہ اپنے جسم کی تمام قابل نمائش چیزوں کی اچھی طرح نمائش کرتی ہیں۔ کسی قسم کی جھجک محسوس کئے بغیر اپنے ایام کی بے ترتیبی کا ذکر کر دیتی ہیں۔ اپنے پرانے معاشروں کا حال سناتی ہیں۔ جب ڈانس کی دھن سنتی ہیں تو اپنی ناگمیں تحرکاتا شروع کر دیتی ہیں۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن کوئی عورت بھی ان تمام خوبیوں کی حامل ہو سکتی ہے۔

رندھیر نے جب گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تھا تو اسے ہرگز ہرگز یقین نہیں تھا کہ وہ اس کو اپنے ساتھ سلاٹے گا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد جب اس نے اس کے بھیگے ہوئے کپڑے دیکھ کر یہ خیال کیا تھا کہ میں ایسا نہ ہو بیچاری کو نمونیہ ہو جائے تو رندھیر نے اس سے کہا تھا۔ ”سردی لگ جائے گی۔“

وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی کیونکہ اس کی آنکھوں میں شرم کے لال ڈورے تیر گئے تھے مگر بعد میں جب رندھیر نے اسے اپنی دھوئی نکال کر دی تو اس نے کچھ دیر سوچ کر اپنا کاشا کھولا، جس کا میل بھیگنے کے باعث اور زیادہ ابھر آیا تھا۔ کاشا کھول کر اس نے ایک طرف رکھ دیا اور جلدی سے سفید دھوئی اپنی رانوں پر ڈال لی۔ پھر اس نے اپنی پھنسی پھنسی چولی اتارنے کی کوشش شروع کی، جس کے دونوں کناروں کو ملا کر اس نے ایک گانٹھ دے رکھی تھی۔ یہ گانٹھ اس کے تدرست سینے کے نخنے مگر میلے گز ہے میں جذبی ہو گئی تھی۔

دیر تک وہ اپنے گھے ہوئے ناخنوں کی مدد سے چولی کی گردھ کھولنے کی کوشش کرتی رہی جو بارش کے پانی سے بہت زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ جب تھک کر ہار گئی تو اس نے مرہٹی زبان میں رندھیر سے کچھ کہا۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ ”میں کیا کروں، نہیں کھلتی۔“

رندھیر اس کے پاس پہنچ گیا اور گردھ کھولنے لگا۔ تھک ہار کر اس نے ایک ہاتھ میں چولی کا ایک سراپکڑا۔ دوسرے ہاتھ میں دوسرا اور زور سے کھینچا۔ گردھ ایک دم پھسلی رندھیر کے ہاتھ زور میں ادھرا دھر ہے دو دھر کتی ہوئی چھاتیاں نمودار ہو گیں۔ رندھیر نے ایک لخت کے لئے خیال کیا کہ اس کے اپنے ہاتھوں نے اس گھاٹن لڑکی کے سینے پر زم زم گندھی ہوئی مٹی کو چاک بک دست کمبار کی طرح دوپیاں والوں شکل دے دی ہے۔

اس کی صحت مند چھاتیوں میں وہی گدراہٹ، وہی جاذبیت، وہی طراوت، وہی گرم گرم ٹھنڈک تھی جو کمبار کے ہاتھوں سے لکلے

ہوئے تازہ تازہ کچے برتوں میں ہوتی ہے۔

میلے رنگ کی ان جوان چھاتیوں میں جو بالکل بے دام تھیں ایک عجیب قسم کی چمک مخلوق تھی۔ سیاہی مائل گندی رنگ کے نیچے دھنڈی روشنی کی ایک تہہ سی تھی جس نے یہ عجیب و غریب چمک پیدا کر دی تھی جو چمک ہونے کے باوجود چمک نہیں تھی۔ اس کے سینے پر چھاتیوں کے یہ ابھار دیے معلوم ہوتے تھے جو تالاب کے گد لے پانی کے اندر جل رہے ہوں۔

برسات کے بھی دن تھے کھڑکی کے باہر پتپل کے پتے کپکاپاہے تھے۔ اس گھاٹن لڑکی کے دونوں کپڑے جو پانی سے شرابور ہو چکے تھے ایک غلیظ ڈھیری کی شکل میں فرش پر پڑے تھے اور وہ رندھیر کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ اس کے نگلے اور میلے بدن کی گرمی رندھیر کے جسم میں وہ کیفیت پیدا کر رہی تھی جو سخت سردیوں میں ناسیوں کے غلیظ مگر گرم جام میں نہاتے وقت محسوس ہوا کرتی تھی۔

ساری رات وہ رندھیر کے ساتھ چمٹی رہی۔ دونوں گویا ایک دوسرے میں غم ہو گئے تھے۔ انہوں نے بمشکل ایک دوباریں کی ہوں گی۔ کیونکہ جو کچھ انہیں کہنا سننا تھا، انسانوں، ہونٹوں اور ہاتھوں سے طے ہوتا رہا تھا۔ رندھیر کے ہاتھ ساری رات اس کی چھاتیوں پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی چوچیاں اور وہ موٹے موٹے سام جوان کے ارد گرد ایک کالے دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے اس ہوائی لمس سے بھی جاگ اشتعہ اور اس گھاٹن لڑکی کے سارے جسم میں ایسا ارتعاش پیدا ہو جاتا کہ رندھیر خود بھی ایک لختے لئے کپکا انتہا۔

ایسی کپکاہٹوں سے رندھیر کا سینکڑوں مرتبہ تعارف ہو چکا تھا۔ وہ اس کی لذت سے اچھی طرح آشنا تھا۔ کئی لڑکیوں کے نرم اور سخت سینوں کے ساتھ اپنا سینہ ملا کر وہ ایسی رات میں گزار چکا تھا۔ وہ ایسی لڑکیوں کے ساتھ بھی رہ چکا تھا جو بالکل الہڑتھیں اور اس کے ساتھ لپٹ کر گھر کی وہ تمام باتیں سنا دیا کرتی تھیں جو کسی غیر کو نہیں سنا نا چاہیں۔ وہ ایسی لڑکیوں سے بھی جسمانی رشتہ قائم کر چکا تھا جو ساری مشقت خود کرتی تھیں اور اسے کوئی تکلیف نہیں دیتی تھیں مگر یہ گھاٹن لڑکی جو اعلیٰ کے درخت کے نیچے بھیگی ہوئی کھڑی تھی اور جس کو اس نے اشارے سے اوپر بلایا تھا بہت ہی مختلف تھی۔

ساری رات رندھیر کو اس کے بدن سے عجیب و غریب قسم کی بوآتی رہی تھی۔ اس بوکو جو بیک وقت خوشبو اور بدبو تھی۔ وہ تمام رات پیتا رہا تھا۔ اس کی بغلوں سے اس کی چھاتیوں سے اس کے بالوں سے اس کے پیٹ سے ہر جگہ سے یہ بوجو بد بوجی تھی اور خوشبو بھی رندھیر کے ہر سانس میں موجود ہوتی تھی۔ تمام رات وہ سوچتا رہا تھا کہ یہ گھاٹن لڑکی بالکل قریب ہونے پر بھی ہرگز ہرگز اتنی زیادہ قریب نہ ہوتی، اگر اس کے نگلے بدن سے یہ بونے اڑتی۔ یہ بوجو اس کے دل و دماغ کے ہر سلوٹ میں رینگ گئی تھی۔ اس کے تمام

پرانے اور نئے خیالوں میں رج گئی تھی۔

اس بونے اس لڑکی کو اور رندھیر کو ایک رات کے لئے آپس میں حل کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ عین تین گھنٹوں میں اتر گئے تھے۔ جہاں پہنچ کر وہ ایک خالص انسانی لذت میں تبدیل ہو گئے تھے۔ ایسی لذت جو لحاظی ہونے کے باوجود داعمی تھی۔ جو آسمان کی نیلا ہٹوں میں ازتا غیر متحرک دکھائی دیتا ہے۔

اس یوکو جو اس گھاٹن لڑکی کے ہر سام سے باہر نکلتی تھی۔ رندھیر اچھی طرح سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ اس کا تجزیہ نہیں کر سکتا تھا۔ جس طرح بعض اوقات مٹی پانی چھڑکنے سے سوندھی سوندھی باس پیدا ہوتی ہے لیکن نہیں وہ بوکھا اور ہی قسم کی تھی، اس میں لوٹر اور عطر کا مصنوعی پن نہیں تھا۔ وہ بالکل اصلی تھی، عورت اور مرد کے باہمی تعلقات کی طرح اصلی اور ازالی۔

رندھیر کو پسینے کی بو سے سخت نفرت تھی۔ وہ نہانے کے بعد عام طور پر اپنی بغلوں وغیرہ میں خوبصوردار پاؤڈر لگاتا تھا یا کوئی ایسی دوا استعمال کرتا تھا جس سے پسینے کی بو بدب جائے لیکن حیرت ہے کہ اس نے کئی بارہاں کئی بار اس گھاٹن لڑکی کی یا لوں بھری بغلوں کو چوما اور اسے بالکل گھن نہ آئی۔ بلکہ عجیب قسم کی لذت محسوس ہوئی۔ اس کی بغلوں کے نرم نرم بال پسینے کے باعث گیلے ہو رہے تھے۔ ان سے بھی وہی بولکتی تھی جو غائب درجہ قابل فہم ہونے کے باوجود ناقابل فہم تھی۔ رندھیر کو ایسا لگتا تھا کہ وہ اس یوکو جانتا ہے، میکنا نتا ہے۔ اس کا مطلب سمجھتا ہے لیکن کسی اور کو سمجھانا نہیں سکتا۔

برسات کے یہی دن تھے۔ یہی کھڑکی کے باہر جب اس نے دیکھا تھا تو پنپل کے پتے لرز لرز کر نہار ہے تھے۔ ہوا میں سرسرابھیں اور پھر پھر باہمیں گھلی ہوئی تھیں۔ اندھیرا تھا مگر اس میں دبی دبی وھندلی ہی روشنی بھی سموئی ہوئی تھی۔ جیسے بارش کے قطروں کے ساتھ لگ کر تاروں کی تھوڑی تھوڑی روشنی اتر آئی ہے۔ برسات کے یہی دن تھے۔ جب رندھیر کے اس کمرے میں ساگوان کا صرف ایک پنگ ہوتا تھا مگر اب اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا بھی پڑا تھا اور کونے میں ایک نئی ڈریسگ پنپل بھی موجود تھی۔ دن یہی برسات کے تھے۔ موسم بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ بارش کے قطروں کے ساتھ تاروں کی تھوڑی تھوڑی روشنی اتر رہی تھی مگر فضائیں حتاکے عطر کی تیز خوبی بھی ہوئی تھی۔ دوسرا پنگ خالی تھا۔ اس پنگ پر جس پر رندھیر اوندھے منہ لیٹا کھڑکی کے باہر پنپل کے لرزتے ہوئے پتوں پر بارش کے قطروں کا رقص دیکھ رہا تھا۔ ایک گوری چٹی لڑکی اپنے ستر کو نگئے جسم سے چھپانے کی تاکام کوشش کرتے کرتے غالباً سو گئی تھی۔ اس کی لال ریشمی شلوار دوسرے پنگ پر پڑی تھی۔ اس کے گھرے سرخ ازار بند کا ایک پھندنا نیچے لٹک رہا تھا۔ اس پنگ پر اس کے دوسرے رکھے ہوئے کپڑے بھی پڑے تھے۔ اس کی شہرے پھولوں والی قمیں انگلیا جانگلیا اور دوپٹے سب کارنگ سرخ تھا۔

بے حد سرخ یہ سب کپڑے حتاکے عطر کی تیز خوشبو میں بے ہوئے تھے۔

لڑکی کے سیاہ بالوں میں مقیش کے ذرے گردکی طرح جائے ہوئے تھے۔ چہرے پر غازے، سرفی اور مقیش کے ان ذرات نے مل جل کر ایک عجیب و غریب رنگ پیدا کر دیا تھا۔ بے جان سا، اڑا اڑا اور اس کے گورے سینے پر انگیا کے کچے رنگ نے جا بجالال لال دھبے ڈال دیئے تھے۔

چھاتیاں دودھ کی طرح سفید تھیں جس میں تھوڑی خلاہت بھی ہوتی ہے۔ بغلوں کے بال منڈے ہوئے تھے۔ جس کے باعث وہاں سرمی غبار سا پیدا ہو گیا تھا۔ رندھیر کنی بار اس لڑکی کی طرف دیکھ کر سوچ چکا تھا۔ کیا ایسا نہیں لگتا، جیسے میں نے ابھی ابھی کیلئے اکھاڑ کر اسے لکڑی کے بند بکس میں سے نکالا ہے۔ کتابوں اور چینی کے برتوں کی طرح۔ کیوں کہ جس طرح کتابوں پر واب کے نشان ہوتے ہیں اور چینی کے برتوں پر ملنے جلنے سے خراشیں آ جاتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اس لڑکی کے بدنا پر کئی جگہ ایسے نشان تھے۔

رندھیر نے اس کی ٹنگ اور چست انگلیا کی ڈوریاں کھوئی تھیں، پیٹھ پر اور سامنے سینے کے زم زم گوشت پر جھریاں اسی بنی ہوئی تھیں اور کمرے کے ارد گرد کس کر بند ہے ہوئے ازار بند کا نشان، وزنی اور نوکیلے جزاً، نیکس سے اس کے سینے پر کئی جگہ خراشیں پیدا ہو گئیں جیسے ناخنوں سے بڑے زور کے ساتھ کھجایا گیا ہے۔ بر سات کے وہی دن تھے۔ پیپل کی زم زم کوں پتیوں پر بارش کے قطرے گرنے سے ویسی ہی آواز پیدا ہو رہی تھی، جیسی کہ رندھیر اس روز تمام رات ستارہا۔ موسم بہت خوشنگوار تھا۔ خندھی خندھی ہوا چل رہی تھی لیکن اس میں حتاکی عطر کی تیز خوشبو گھلی ہوئی تھی۔

رندھیر کے ہاتھ بہت دیر تک اس گوری چینی لڑکی کے کچے دودھ ایسے سفید سینے پر ہوائی لمس کر طرح پھرتے رہے۔ اس کی انگلیوں نے اس گورے جسم میں کئی ارتعاش دوڑتے ہوئے محبوس کیے تھے۔ اس زم زم جسم کے کئی گوشوں میں اسے سمٹی ہوئی کپکپا ہٹوں کا بھی پتہ چلا تھا۔ جب اس نے اپنا سینہ اس کے سینے کے ساتھ ملا یا تو رندھیر کے جسم کے ہر سامنے اس لڑکی کے چہرے ہوئے تاروں کی آواز سنی تھی۔ لیکن وہ پکار کہاں تھی۔ وہ پکار جو اس نے گھاٹن لڑکی کے جسم کی بو میں سو گھنی تھی۔ وہ پکار جو دودھ کے پیاسے پچ کے روئے سے کہیں زیادہ قابل فہم تھی۔ وہ پکار جو صوتی حدود سے نکل کر بے آواز ہو گئی تھی۔

رندھیر سلانخوں والی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کے بہت قریب پیپل کے پتے لرز رہے تھے۔ مگر وہ ان کی لرزشوں کے اس پار دور بہت دور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہاں اسے مٹھیلے بادلوں میں ایک عجیب جسم کی دھنڈلی روشنی گھلی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ جیسے اس گھاٹن لڑکی کے سینے میں اسے نظر آئی تھی۔ ایسی روشنی جو راز کی بات کی طرح چھپی ہوئی تھی مگر ظاہر تھی۔

رندھیر کے پہلو میں ایک گوری چینی لڑکی جس کا جسم دودھ اور گھنی ملے آئے کی طرح ملامم تھا، لیئن تھی۔ اس کے سوئے ہوئے جسم سے حتاکے عطر کی خوبی آ رہی تھی۔ جواب تھکنی تھکنی معلوم ہوتی تھی۔ رندھیر کو یہ دم توڑتی اور حالت نزع کو پہنچی ہوئی خوبی بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ اس میں کچھ کھٹاسی تھی۔ ایک عجیب قسم کی کھٹاس جس طرح بدھضی کی ڈکاروں میں ہوتی ہے۔ اداں بے رنگ بے کیف۔

رندھیر نے اپنے پہلو میں لیٹی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا، جس طرح پہنچنے ہوئے دودھ میں سفید سفید بے جان پھٹکلیاں بے رنگ پانی میں ساکن ہوتی ہیں۔ اسی طرح اس لڑکی کی نسوانیت اس کے وجود میں بھرپوری ہوئی تھی۔ سفید سفید دھبیوں کی صورت میں ۔۔۔۔۔ اصل میں رندھیر کے دل و دماغ میں وہ بوبی ہوئی تھی جو اس گھاٹن لڑکی کے جسم سے بغیر کسی بیرونی کوشش کے باہر نکل رہی تھی۔ وہ بوجو حتاکے عطر سے زیادہ کہیں زیادہ بکلی پھٹکلی اور دور رس تھی۔ جس میں سونگھے جانے کا اضطراب نہیں تھا جو خود بخودناک کرتے داخل ہوا کاپنی صحیح منزل پر پہنچ گئی تھی۔

رندھیر نے آخر کوشش کرتے ہوئے اس لڑکی کے دو دھیائے جسم پر ہاتھ پھیرا، مگر اسے کوئی کپکا ہٹ محسوس نہ ہوئی۔ اس کی نئی نویلی بیوی جوفرست کلاس مجسٹریٹ کی لڑکی تھی؛ جس نے لبی اے تک تعلیم پائی تھی اور اپنے کالج میں سینکڑوں لڑکوں کے دل کی وھردنکن تھی، رندھیر کی بعض تیز نہ کر سکی۔ وہ حتاکی مرتبی ہوئی خوبیوں میں اس بوکی جھنجو کرتا ہوا جو بر سات کے انہی دنوں میں جبکہ کھڑکی کے باہر پہنچنے کے پتے بارش میں نہار ہے تھے اسے گھاٹن لڑکی کے میلے جسم سے آئی تھی۔

## دھوال

وہ جب اسکول روانہ ہوا تو اس نے راستے میں ایک قصائی دیکھا جس کے سر پر ایک بہت بڑا نوک راتھا اس میں تازہ ذبح کے ہوئے بکرے تھے۔ کھالیں اتری ہوئی تھیں اور ان کے ننگے گوشت میں سے دھوال انھر راتھا جگہ جگہ پر یہ گوشت جس کو دیکھ کر مسعود کے مخندے گا لوں پر گرمی کی لبرس سی دوڑ جاتی تھیں۔ پھر کر راتھا جیسے کبھی کبھی اس کی آنکھ پھرنا کرتی۔

سو انو بجے ہوں گے مگر جھکے ہوئے خاکستری بادلوں کے باعث ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سویرا ہے۔ سردی میں شدت نہیں تھی۔ لیکن راہ چلتے آدمیوں کے منہ سے گرم گرم سہادار کی ٹونٹیوں کی طرح گاڑھا سفید دھوال نکل رہا تھا۔ ہر شے بوجھل دکھائی دیتی تھی۔ جیسے بادلوں کے وزن کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ موسم پکھوٹی ہی کیفیت کا حامل تھا جو بڑے جو تے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ بازار میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی اور دکانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ آواز ایں مہم تھیں۔ جیسے سر گوشیاں ہو رہی ہیں چپکے چپکے دھیرے دھیرے باتیں ہو رہی ہیں۔ ہولے ہولے لوگ قدم اٹھا رہے ہیں کہ زیادہ اوپری آواز پیدا نہ ہو۔

مسعود بغل میں بستہ دبائے اسکول جا رہا تھا۔ آج اس کی چال بھی ست تھی۔ جب اس نے کھال کے تازہ ذبح کے ہوئے بکروں کے گوشت سے سفید سفید دھوال اٹھتا دیکھا تو اسے راحت محسوس ہوئی۔ اس دھوئیں نے اس کے مخندے گا لوں پر گرم گرم لکیروں کا ایک جال سا بن دیا۔ اس گرمی نے اسے راحت پہنچائی اور سوچنے لگا کہ سردیوں میں مخندے نہ ہاتھوں پر بید کھانے کے بعد اگر یہ دھوال مل جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔

فضا میں اجلان پن نہیں تھا۔ روشنی تھی مگر دھنڈلی۔ کہر کی ایک پتلی تہہ ہر شے پر چڑھی ہوئی تھی؛ جس سے فضائیں گدلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ یہ گدلا پن آنکھوں کو اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے کہ نظر آنے والی چیزوں کی نوک پلک پکھہ مدمم پڑ گئی تھی۔

مسعود جب اسکول پہنچا تو اسے اپنے ساتھیوں سے یہ معلوم کر کے قطعی طور پر خوش نہ ہوئی کہ اسکول سکتر صاحب کی موت کے باعث بند کر دیا گیا ہے سب لڑکے خوش تھے جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے میتے ایک جگہ پر رکھ کر اسکول کے صحن میں اوت پنگ کھیلوں میں مشغول تھے۔ کچھ چھٹی کا پتہ معلوم کرتے ہی گھر چلے گئے۔ کچھ آرہے تھے اور کچھ نوٹس بورڈ کے پاس جمع تھے اور بار بار ایک ہی عبارت پڑھ رہے تھے۔

مسعود نے جب سنا کہ سکتر صاحب مر گئے ہیں تو اسے بالکل افسوس نہ ہوا اس کا دل جذبات سے بالکل خالی تھا۔ البتہ اس نے یہ

ضرور سوچا کہ پچھلے برس جب اس کے دادا جان کا انتقال ان ہی دنوں میں ہوا تھا تو ان کا جنازہ لے جانے میں بڑی دقت ہوئی تھی۔ اس لئے کہ بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ بھی جنازے کے ساتھ گیا تھا اور قبرستان میں پچھنی کچھر کے باعث ایسا پھسلا تھا کہ کھدی ہوئی قبر میں گرتے گرتے بچا تھا۔ یہ سب باتیں اس کو اچھی طرح یاد تھیں۔ سردی کی شدت، اس کے کچھر سے لت پت کپڑے سرخی مائل نیلے ہاتھ جن کو دبانے سے سفید سفید ہے پڑ جاتے تھے۔ ناک جو کہ برف کی ڈلی معلوم ہوتی تھی اور پھر آ کر ہاتھ پاؤں دھونے اور کپڑے بدلنے کا مرحلہ۔ یہ سب کچھ اس کو اچھی طرح یاد تھا چنانچہ جب اس نے سکتر صاحب کی موت کی خبر سنی تو اسے یہ سب بینی ہوئی باتیں یاد آ گئیں اور اس نے سوچا جب سکتر صاحب کا جنازہ اٹھے گا تو بارش شروع ہو جائے گی اور قبرستان میں اتنی کچھر ہو جائے گی کہ کئی لوگ پھسلیں گے اور ان کو ایسی چوٹیں آئیں گی کہ بلباٹھیں گے۔

مُسعود نے یہ خبر سن کر سید حافظی کلاس کا رخ کیا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنے ڈسک کا تالا کھولا۔ دو تین کتابیں جو کہ اسے دوسرے روز پھر لانا تھیں۔ اس میں رکھیں اور باقی بستہ اٹھا کر گھر کی جانب چل پڑا۔

راستے میں اس نے پھر وہی دو تازہ ذبح کئے ہوئے بکرے دیکھے۔ ان میں سے ایک کواب قصائی نے لٹکا دیا تھا۔ دوسراتختے پر پڑا تھا۔ جب مُسعود کان پر سے گزر ا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ گوشت کو جس میں سے دھواں اٹھو رہا تھا چھو کر دیکھے۔ چنانچہ اس نے آگے بڑھ کر انگلی سے بکرے کے اس حصے کو چھو کر دیکھا جو بھی تک پھر کر رہا تھا۔ گوشت گرم تھا۔ مُسعود کی ٹھنڈی انگلی کو یہ حرارت بہت بھلی معلوم ہوئی۔ قصائی دکان کے اندر چھریاں تیز کرنے میں مصروف تھا۔ چنانچہ مُسعود نے ایک بار پھر گوشت کو چھو کر دیکھا اور وہاں سے چل پڑا۔

گھر پہنچ کر اس نے جب اپنی ماں کو سکتر صاحب کی موت کی خبر سنائی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے ابا جی انبی کے جنازے کے ساتھ گئے ہیں۔ اب گھر میں صرف دوآدمی تھے۔ ماں اور بڑی بہن۔ ماں باور پی خانہ میں بیٹھی سالن پکار رہی تھی اور بڑی بہن کلشوم پاس ہی ایک کانگڑی لیے درباری کی سرگم یاد کر رہی تھی۔

چونکہ انگلی کے دوسرے لڑکے گورنمنٹ اسکول میں پڑھتے تھے جس پر اسلامیہ اسکول کے سکتر کی موت کا کچھ اشارہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے مُسعود نے خود کو بالکل بیکار محسوس کیا۔ اسکول کا کوئی کام بھی نہیں تھا۔ چھٹی جماعت میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ گھر میں اپنے ابا جی سے پڑھ چکا تھا۔ کھلینے کے لیے بھی اس کے پاس کوئی چیز نہیں۔ ایک میلہ کچھلاتا ش طاق میں پڑا تھا مگر اس سے مُسعود کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لہذا اور اسی قسم کے دوسرے کھلیل جو اس کی بڑی بہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہر روز کھلیتی تھی اس کی سمجھتے بالاتر تھے۔ سمجھتے

سے بالاتر یوں تھے کہ مسعود نے کبھی ان کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی اس کو فطرتاً یا کے کھیلوں سے کوئی لگانہیں تھا۔

بستے اپنی جگہ پر رکھنے اور کوٹ اتارنے کے بعد وہ باورچی خانے میں اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا اور درباری کی سرگم ستارہا۔ جس میں کہنی دفعہ سارے گاما آتا تھا۔ اس کی ماں پالک کاٹ رہی تھی۔ پالک کامنے کے بعد اس نے بزرگ بزرگ توں کا گیلا گیلا ڈھیر اٹھا کر ہندڑ یا میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب پالک کو آج ٹکی تو اس میں سے سفید سفید دھواں اٹھنے لگا۔ اس دھوکیں کو دیکھ کر مسعود کو بکرے کا گوشت یاد آگیا۔ چنانچہ اس نے اپنی ماں سے کہا۔ ”امی جان، آج میں نے قصائی کی دکان پر دو بکرے دیکھے۔ کھال اتری ہوئی تھی اور ان میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسا کہ صحیح سورے میرے منہ سے نکلا کرتا تھا۔“

”اچھا!“ یہ کہہ کر اس کی ماں چولہے میں لکڑیوں کے کوئے جھاڑنے لگی۔

”ہاں! اور میں نے گوشت کو اپنی انگلی سے چھوکر دیکھا تو وہ گرم تھا۔“

”اچھا!“ یہ کہہ کر اس کی ماں نے وہ برتن اٹھایا جس میں اس نے پالک کا ساگ دھویا تھا اور باورچی خانے سے باہر چل گئی۔

”اور یہ گوشت کنی جگہ پر پھر کتا بھی تھا۔“

”اچھا،“ مسعود کی بڑی بہن نے درباری سرگم یاد کرنا چھوڑ دی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”کیسے پھر کتا تھا؟“

”یوں۔۔۔۔۔۔ یوں!“ مسعود نے انگلیوں سے پھر کن پیدا کر کے اپنی بہن کو دکھائی۔

”پھر کیا ہوا؟“

یہ سوال کلثوم نے اپنے سرگم بھرے دماغ سے اس طور نکالا کہ مسعود ایک لمحے کے لئے بالکل خالی الذہن ہو گیا۔ ”پھر کیا ہونا تھا!“ میں نے ایسے ہی آپ سے بات کی تھی کہ قصائی کی دکان پر گوشت پھر کر رہا تھا۔ میں نے انگلی سے چھوکر بھی دیکھا تھا، گرم تھا۔

”گرم تھا..... اچھا مسعود یہ بتاؤ تم میرا ایک کام کرو گے۔“

”بتائیے!“

”آؤ میرے ساتھ آؤ۔“

”نہیں پہلے آپ بتائیے، کام کیا ہے۔“

”تم آؤ تو سبی میرے ساتھ!“

”جی نہیں، آپ پہلے کام بتائیے۔“

دیکھو میری کمر میں بڑا درد ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ میں پنگ پر لیٹتی ہوں۔ تم ذرا پاؤں سے دبادینا۔ اچھے بھائی جو ہوئے۔ اللہ کی قسم بڑا درد ہو رہا ہے۔"

یہ کہہ کر مسعود کی بہن نے اپنی کمر پر مکیاں مارنا شروع کر دیں۔

"یہ آپ کی کمر کو کیا ہو جاتا ہے۔ جب دیکھو درد ہو رہا ہے اور پھر آپ دبواتی بھی مجھی سے ہیں۔ کیوں نہیں اپنی سہیلیوں سے کہتیں۔" مسعود انھ کھڑا ہوا اور راضی ہو گیا۔ "چاۓ، لیکن آپ سے یہ کہہ دیتا ہوں کہ دس منٹ سے زیادہ بالکل نہیں دباو گا۔"

"شabaش، شabaش۔" اس کی بہن انھ کھڑی ہوئی اور سرگموں کی کالپی سامنے طاق میں رکھ کر اس کمرے کی طرف روانہ ہوئی۔ جہاں وہ اور مسعود دونوں سوتے تھے۔

صحن میں پہنچ کر اس نے اپنی دکھتی ہوئی کمر سیدھی کی اور آسان کی طرف دیکھا۔ غیالے بادل جھکے ہوئے تھے۔

"مسعود آج ضرور بارش ہو گی۔" یہ کہہ کر اس نے مسعود کی طرف دیکھا اگر وہ اندر اپنی چار پائی پر لیٹا تھا۔

جب کلثوم اپنے پنگ پر اونڈھے مند لیٹ گئی تو مسعود نے انھ کر گھڑی میں وقت دیکھا۔ "ویکھنے باجی گیا رہ بنجئے میں دس منٹ باقی ہیں۔ پورے گیا رہ بجے آپ کی کردابنا چھوڑ دوں گا۔"

"بہت اچھا، لیکن تم اب خدا کے لئے زیادہ نخرے نہ بکھارو۔ ادھر میرے پنگ پر آ کر جلدی کردباو، ورنہ یاد رکھو۔۔۔۔۔ بڑے زور سے کان انٹھکھوں گی۔" کلثوم نے مسعود کوڑا انت پلائی۔ مسعود نے اپنی بڑی بہن کے حکم کی تعییں کی اور دیوار کا سہارا لے کر پاؤں سے اس کی کردبana شروع کر دی۔ مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکا و پیدا ہو گیا۔ جب اس نے پیروں سے دبana شروع کیا غھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں۔ تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہو لے ہائے ہائے" کرنا شروع کیا۔

کلثوم کے کوہوں پر گوشت زیادہ تھا۔ جب مسعود کا پاؤں اس حصے پر پڑا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس بکرے کے گوشت کو دبایا ہے جو اس نے قصائی کی دکان میں اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تھا۔ اس احساس نے چند لمحات کے لیے اس کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا کئے۔ جن کا کوئی سر تھا نہ پیرو وہ ان کا مطلب نہ بھھ سکا اور سمجھتا بھی کیسے جبکہ کوئی خیال مکمل ہی نہ تھا۔

ایک دوبار مسعود نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے پیروں کے نیچے گوشت کے لوٹھروں میں حرکت پیدا ہوئی ہے۔ اس قسم کی حرکت جو اس نے بکرے کے گرم گرم گوشت میں دیکھی تھی۔ اس نے بڑی بد دلی سے کردبana شروع کی تھی مگر اب اسے اس کام میں لذت

محسوس ہونے لگی۔ اس کے وزن کے نیچے کلٹوم ہو لے ہو لے کراہ رہی تھی۔ یہ پچھی بچھی آواز جو کہ مسعود کے پیروں کی حرکت کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس گمانامی لذت میں اضافہ کر رہی تھی۔

ٹائم پیس میں گیارہ نجع گئے۔ مگر مسعود اپنی بہن کلٹوم کی کردبار تارہا۔ جب کمراچھی طرح دبائی جا چکی تو کلٹوم سیدھی لیٹ گئی اور کہنے لگی۔ ”شاباش مسعود شاباش۔ لواب لگے ہاتھوں ٹانگیں بھی دبادو۔ بالکل اسی طرح شاباش میرے بھائی۔“

مسعود نے دیوار کا سہارا لے کر کلٹوم کی رانوں پر جب اپنا پوار اوزن ڈالا تو اس کے پاؤں کے نیچے مچھلیاں ہی تڑپ گئیں۔ بے اختیار وہ جس پڑی اور دوہری ہو گئی۔ مسعود گرتے گرتے بچا، لیکن اس کے تکوؤں میں مچھلیوں کی تڑپ بندھی ہو گئی۔ اس کے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر اسی طرح دیوار کا سہارا لے کر اپنی بہن کی رانیں دبائے چنانچہ اس نے کہا۔ ”یہ آپ نے ہتنا کیوں شروع کر دیا؟ سیدھی لیٹ جائیے۔ میں آپ کی ٹانگیں دبادوں۔“

کلٹوم سیدھی لیٹ گئی۔ رانوں کی مچھلیاں ادھر ادھر ہونے کے باعث جو گدگدی پیدا ہوتی تھی، اس کا اثر ابھی تک اس کے جسم میں باقی تھا۔ ”تابھائی میرے گدگدی ہوتی ہے تم وحشیوں کی طرح دباتے ہو۔“

مسعود نے خیال کیا کہ شاید اس نے غلط طریقہ استعمال کیا ہے۔ ”نہیں، آب کی دفعہ میں پورا بوجھ آپ پر نہیں ڈالوں گا، آپ الٹیمان رکھئے۔ آب اسی اچھی طرح دباؤں گا کہ آپ کو کوئی تنکیف نہ ہوگی۔“

دیوار کا سہارا لے کر مسعود نے اپنے جسم کو تولا اور اس انداز میں سے آہستہ آہستہ کلٹوم کی رانوں پر اپنے پیروں جمائے کہ اس کا آدھا بوجھ کہیں غائب ہو گیا۔ ہو لے ہو لے بڑی ہوشیاری سے اس نے پیروں کے نیچے شروع کئے۔ کلٹوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب دب کر ادھر ادھر پھیلنے لگیں۔ مسعود نے ایک بار اسکوں میں تنے ہوئے رے پر ایک باز مگر کو چلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ باز مگر کے پیروں کے نیچے تباہوار سا اسی طرح پھیلتا ہو گا۔

اس سے پہلے کئی بار اس نے اپنی بہن کلٹوم کی ٹانگیں دبائی تھیں مگر وہ لذت جو کہ اسے اب محسوس ہو رہی تھی۔ پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے سوچا کلٹوم کو اگر ذبح کیا جائے تو کھال اتر جانے پر کیا اس کے گوشت میں سے بھی دھواں نکلے گا؟ لیکن اسکی بے ہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا جیسے وہ سلیٹ کو اسٹنچ سے صاف کیا کرتا تھا۔

”بس!“ کلٹوم تھک گئی۔ ”بس!“

مسود کو ایک دم شرارت سمجھی۔ وہ پلٹ پر سے نیچے اترنے لگا تو اس نے کافی دنوں بخلوں میں گدگدی شروع کر دی۔ بھی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اس میں اتنی سخت نہیں تھی کہ مسعود کے ہاتھوں کو پرے جھک دے لیکن جب اس نے ارادہ کر کے اس کے لات بھانی چاہی تو مسعود اچھل کر زدے باہر ہو گیا اور سپر پہن کر کمرے سے نکل گیا۔

جب وہ صحن میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے۔ بادل اور بھی جھک آئے تھے۔ پانی کے نہیں نہیں قطرے آواز پیدا کئے بغیر صحن کی اینٹوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہے تھے۔ مسعود کا جسم ایک دلواز حرارت محسوس کر رہا تھا۔ جب ہوا کا شہنڈا شہنڈا جھونکا اس کے گالوں کے ساتھ مس ہوا اور وہ تین تھیں نہیں بوندیں اس کی ناک پر پڑیں تو ایک جھر جھری سی اس کے بدن میں اہرا اٹھی سامنے کوٹھی کی دیوار پر ایک کبوتری پاس پاس پر پھیلانے بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنوں دم پختت کی ہوئی ہندیا کی طرح گرم ہیں۔ گل داؤ دی اور ناز بوکے ہرے ہرے پتے اور لال لال گملوں میں نہار رہے تھے۔ فضائیں نیندیں گھلی ہوئی تھیں۔ ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے ارد گرد زرم خواب یوں پلٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔

مسعود ایسی باتیں سوچنے لگا جن کا مطلب اس کی سمجھیں نہیں آتا تھا۔ وہ ان باتوں کو چھو کر دیکھ سکتا تھا مگر ان کا مطلب اس کی گرفت سے باہر تھا پھر بھی ایک گمنام سامرا اس سوچ بچار میں اسے آ رہا تھا۔

بارش میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے باعث جب مسعود کے ہاتھ بالکل نہ ہو گئے اور دہانے سے ان پر سفید دھمپے پڑنے لگے تو اس نے مٹھیاں کس لیں اور ان کو مند کی بھاپ سے گرم کرنا شروع کیا۔ ہاتھوں کو اس عمل سے کچھ گرمی تو پہنچی مگر وہ نہ آسود ہو گئے۔ چنانچہ آگ تاپنے کے لئے وہ باور پی خانے میں چلا گیا۔ کھانا تیار تھا۔ ابھی اس نے پہلا لقرہ ہی اٹھایا تھا کہ اس کا باپ قبرستان سے واپس آگیا۔ باپ بیٹے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مسعود کی ماں اٹھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی اور وہاں دیر تک اپنے خاوند کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔

کھانے سے فارغ ہو کر مسعود بیٹھک میں چلا گیا اور کھڑکی کھول کر فرش پر لیٹ گیا۔ بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ اب ہوا بھی چل رہی تھی۔ مگر یہ سردی ناخوشگوار نہیں معلوم ہوتی تھی۔ تالاب کے پانی کی طرح یہ اوپر شہنڈی اور اندر گرم تھی۔ مسعود جب فرش پر لیٹا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس سردی کے اندر دھنس جائے۔ جہاں اس کے جسم کو راحت اگلیز کریں پہنچے۔ دیر تک وہ ایسی شیر گرم باتوں کے متعلق سوچتا رہا۔ جس کے باعث اس کے پھوٹوں میں ہلکی ہلکی دھمکن پیدا ہو گئی۔ ایک

دوبار اس نے انگڑائی لی تو اسے مزا آیا۔ اس کے جسم کے کسی حصے میں یا اس کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں کوئی چیز انک سی گئی تھی۔ یہ چیز کیا تھی ۔۔۔۔۔ اس کے متعلق بھی مسعود کو علم نہیں تھا البتہ اس انکا ورنے اس کے سارے جسم میں اضطراب ایک دبے ہوئے اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کا سارا جسم کھنچ کر لمبا ہو جانے کا ارادہ بن گیا تھا۔

دیر تک گدگدے قائم پر کروٹیں بدلتے کے بعد وہ اٹھا اور باور پچی خانے سے ہوتا ہوا صحن میں آنکلا۔ کوئی باور پچی خانے میں تھا نہ صحن میں۔ ادھر ادھر جتنے کرے تھے۔ سب کے سب بند تھے بارش اب رک گئی تھی۔ مسعود نے ہاکی اور گینڈ نکالی اور صحن میں کھیلنا شروع کر دیا۔ ایک بار جب اس نے زور سے ہٹ لگائی تو گینڈ صحن کے دامیں ہاتھ والے کمرے کے دروازے پر لگی۔ اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی۔ ”کون؟“

”جی میں ہوں مسحوق!“

اندر سے آواز آئی۔ ”کیا کر رہے ہو؟“

”جی کھیل رہا ہوں۔“

”کھلیو“ پھر تھوڑے سے توقف کے بعد اس کے بارے نے کہا۔ ”تمہاری ماں میرا سردبار ہی ہے۔ زیادہ شور و شھانا۔“

یہ سن کر مسعود نے گیندو بیس پڑی رہنے دی اور ہاکی کا ہاتھ میں لئے سامنے والے کمرے کا رخ کیا۔ اس کا ایک دروازہ بند تھا اور دوسرا نہ تھا۔ مسعود کو ایک شرارت سمجھی۔ دبے پاؤں وہ شیم باز دروازے کی طرف بڑھا اور دھماکے کے ساتھ دونوں پٹکھول دیئے۔ دوچھینی بلند ہو گئی اور کلشوم اور اس کی سیلیں بدلانے جو کہ یاس پاس لیتی تھیں۔ خوفزدہ ہو کر جھٹ سے لحاف اور ھلپا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مسعود کچھ سمجھنے سکا۔ اس کے دماغ پر دھواں سا چھا گیا۔ وہاں سے اٹے قدم لوٹ کر وہ جب بیٹھ کی طرف روانہ ہوا تو اسے معاً ہیئے اندر ایک اتحاد طاقت کا احساس ہوا جس نے کچھ دیر کے لئے اس کی سوچتے سمجھنے کی قوت بالکل کمزور کر دی۔

بینہک میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر جب مسعود نے ہاکی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھٹنے پر رکھا تو یہ سوچا کہ ہلاک سادباڈا لئے پر بھی ہاکی میں خم پیدا ہو جائے گا اور زیادہ زور لگانے پر تو بینڈل چٹاٹ سے ٹوٹ جائے گا۔ اس نے گھٹنے پر ہاکی کے بینڈل میں خم تو پیدا کر لیا مگر زیادہ سے زیادہ زور لگانے پر بھی وہ ٹوٹ نہ سکا۔ دیر تک وہ ہاکی کے ساتھ کشتی لٹاتا رہا۔ جب تھک ہار گیا تو جھنجلا کر اس نے ہاکی پرے چھینک دی۔



## کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی۔ جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ اگریزی کے دس پندرہ جنٹے سیکھ گئی تھی، ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک دن اس نے اپنی پڑوسن ملنچہ جان سے کہا۔ ”دس لیف۔۔۔ ویری بید۔۔۔“ یعنی یہ زندگی بہت بری ہے۔ جبکہ کھانے ہی کو نہیں ملتا۔“ انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آ جاتے تھے اور وہ تمن چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر میں تمیں روپے پیدا کر لیا کرتی تھی۔ یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں کوئی ٹک نہیں کروہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر ان کی زبان سے علمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے تو وہ سرہلا کر کہد دیا کرتی تھی۔ ”صاحب! ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا۔“ اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ وہ حیرت سے اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ ان سے کہتی۔ ”صاحب! تم ایک دم الوا کا پٹھا ہے، حرامزادہ ہے۔۔۔۔۔۔ سمجھا!“ یہ کہتے وقت وہ اپنے لبجھ میں سختی پیدا نہ کرتی۔ بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان سے با تین کرتی۔ گورے بنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل الوکے پٹھے دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی؟ ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تمن میں اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہ جوئے ہو گئے تھے جہاں اس نے سنا تھا کہ بڑے لاث صاحب رہتے ہیں جو گرمیوں میں شملے چلے جاتے ہیں۔ صرف چھا آدمی اس کے پاس آئے تھے، صرف چھ۔۔۔۔۔۔ یعنی میں میں میں دو۔ اور ان چھ گاہوں سے اس نے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ساز ہے اخخارہ روپے وصول کئے تھے۔ تمن روپے سے زیادہ پر کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپناریٹ دس روپے بتایا تھا مگر تجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے سیکھی کہا تھا۔ ”بھی ہم تمن روپے سے زیادہ ایک کوڑی نہیں دیں گے۔“ جانے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تمن روپے کے قابل سمجھا۔ چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے کہا۔ ”دیکھو میں تمن روپے ایک ٹیم کے لوگی؟ اس سے ایک دھیلام تم کم کھو تو نہ ہوگا۔ اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ۔“ چھٹے آدمی نے یہ بات سن کر تکرار

خدا بخش اور سلطان کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خدا بخش راولپنڈی کا تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سمجھی چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہو گئی۔ اس کو بھگا کروہ ساتھ لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا اس لیے اس نے عورت کو پیشے پر بھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور پھر وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالہ میں ہے۔ وہ اس کی تلاش میں آیا جیاں اس کو سلطان میں لے گئی۔ سلطان نے اس کو پسند کیا چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اٹھا۔ عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی اس لیے اس نے سمجھا کہ خدا بخش برا بھا گوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظرؤں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی مختی تھا۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فونو گرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیسرے سے فونو کھینچا کرتا تھا۔ اس نے فونو کھینچا سیکھا پھر سلطانہ سے ساختہ روپے لے کر کیسہ بھی خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پردو بنوا یادو کر سیاں خریدیں اور فونو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا۔ چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا انبالہ چھاؤنی میں قائم کر لیا۔ یہاں وہ گوروں کے فونو کھینچتا۔ ایک میئنے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہو گئی۔ چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعہ سے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے۔

سلطانہ نے کانوں کے لیے بندے خریدے۔ ساڑھے پانچ تو لے کی آٹھ کنگلیاں بھی بنوائیں۔ دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کر لیں۔ گھر میں فرنچیپر وغیرہ بھی آگئیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوشحال تھی مگر ایکا ایکی جانے خدا بخش کے دل میں کیا سماں کی کہ اس نے دہلی جانے کی مخان لی۔ سلطانہ انکار کیسے کرتی جبکہ خدا بخش کو اپنے لیے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کر لیا۔ بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاث صاحب رہتے ہیں اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سن چکی تھی۔ پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ تھی جس سے اسے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ جلدی گھر کا بھاری سامان پیچ بانچ کروہ خدا بخش کے ساتھ دہلی آگئی۔ یہاں پہنچ کر خدا بخش نے میں روپے ماہوار پر یہ فلیٹ لیا۔ جس میں دونوں رہتے گئے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ میوپل کمپیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کبیوں کے لیے مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں۔ نیچے دکانیں تھیں اور اوپر وہ منزلہ رہائشی فلیٹ۔ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی تھیں۔ اس لیے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت محسوس ہوئی تھی۔ پرجب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کی ایک پکی نشانی مل گئی۔ ”یہاں میلے کپڑوں کی دھلانی کی جاتی ہے۔“ یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی۔ اسی طرح اس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کر لی تھیں مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں

”کوکلوں کی دکان“ لکھا تھا وہاں اس کی سیکلی ہیرا بائی رہتی تھی جو کبھی بھی ریڈ یو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں ”شرفاء“ کے لیے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے، لکھا تھا وہاں اس کی دوسری سیکلی مختار رہتی تھی۔ نواز کے کارخانے کے اوپر انوری رہتی تھی جو اسی کارخانے کے سینٹھ کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ سینٹھ صاحب کورات کے وقت اپنے کارخانے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اس لیے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دکان کھولتے ہی گا کہ تھوڑے ہی آتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکارہی تو اس نے بھی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی۔ پرجب دو مہینے گزر گئے اور کوئی آدمی اس کے کوئے پر نہ آیا تو اسے بہت تشوش ہوئی۔ اس نے خدا بخش سے کہا۔ ”کیا بات ہے خدا بخش! پورے دو مہینے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے کسی نے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا۔ مانقی ہوں آج کل بازار بہت مندا ہے پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی خل دیکھنے ہی میں نہ آئے۔“ خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصہ سے کھٹک رہی تھی مگر وہ خاموش تھا پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا۔ ”میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں۔ ایک بات سمجھے میں آتی ہے۔ وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ باغ دوسرے دھندوں میں پڑ کر ادھر کا رستہ بھول گئے ہیں۔۔۔۔۔ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ۔۔۔۔۔“ وہ اس سے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیزھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی۔ خدا بخش نے پک کر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی اندر واپس ہوا۔ یہ پہلا گاہک تھا۔ جس سے تمیں روپے میں سودا طے ہوا۔ اس کے بعد پانچ اور آئے۔ یعنی تمیں مہینے میں چھہ جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے۔

میں روپے ماہوار توفیقیت کے کرایہ میں چلے جاتے تھے۔ پانی کے ٹکس اور بجلی کا بل جدا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ کھانا پینا، کپڑے لئے دوا دار و اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تمیں مہینے میں آئے تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے۔ سلطانہ پریشان ہو گئی۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنٹنیاں جو اس نے انبالہ میں بنوائی تھیں، آہستہ آہستہ بک گئیں۔ آخری کنٹنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا۔ ”تم میری ستو اور چلو واپس انبالہ۔۔۔۔۔ یہاں کیا دھرا ہے؟۔۔۔۔۔ بھی ہو گا، پر ہمیں تو یہ شہر را کام بھی وہاں خوب چلتا تھا، چلو وہیں چلتے ہیں۔ جو نقصان ہوا ہے اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو۔ اس کنٹنی کو پیچ کر آؤ۔ میں اساب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں۔ آج رات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے۔“

خدا بخش نے کنٹنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا۔ ”نہیں جان من! انبالہ نہیں جائیں گے، نہیں دہلی میں رہ کر کماں گے۔

یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب نیتیں واپس آئیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو وہ بڑا کار ساز ہے۔ یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بناہی دے گا۔"

سلطان چپ ہو رہی۔ چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اتر گئی۔ بچے ہاتھ دکھ کر اس کو بہت دکھ ہوتا تھا، پر کیا کرتی پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔

جب پانچ میںے گزر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوڑائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخشن بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطانہ کو اس کا بھی دکھ تھا۔ اس میں کوئی ٹک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی، پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اور اس کو بہت برا لگتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سکھیوں سے ملا جانا ترک کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے سنان مکان میں بیٹھی رہتی۔ کبھی چھالیا کامنی رہتی۔ کبھی اپنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی باہر بالکوئی میں آ کر جنگل کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متھر انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سرک کی دوسری طرف مال گودام تھا۔ جو اس کونے سے اس کو نہ تک پھیلا ہوا تھا۔ دابنے ہاتھ کو لو ہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گاٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر حرم کے مال و اسباب کے ڈھیر سے لگ رہتے تھے۔ باسیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا۔ جس میں بے شمار ریل کی پڑیاں پچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لو ہے کی یہ پڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جوں پر نیلی نیلی ریگیں بالکل ان پڑیاں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجنی اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پچھک سدا گوچتی رہتی تھی۔ صبح سوریے جب وہ اٹھ کر بالکوئی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا۔ دھند کے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواؤ نکلتا اور گدے آسان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح امتحاد کھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پڑیاں سے اٹھتے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھمل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہوا کیلے پڑیاں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود نہ ہو دیجاتی ہے۔ دوسرے لوگ کافی نہ بدل رہے ہیں اور وہ چلی جاتی ہے۔ نہ جانے کہاں پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو گا اور وہ کہیں رک جائے گی۔ ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہو گا۔

یوں تودہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیز ٹھیک پڑیوں اور ٹھییرے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہی۔ پر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ اب بالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسیش کے پاس ہی اس کا مکان تھا مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اب تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پڑیوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور وھواں انھر ہاے ایک بہت بڑا چکلہ ہے۔ بہت ہی گاڑیاں ہیں جن کو چند موٹے موٹے انجن اور ہرا دردھلیتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو تو بعض اوقات یہ انجن سینہ معلوم ہوتے۔ جو کبھی کبھی ابالہ میں اس کے ہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ کبھی تھی کہ ایسی بائیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے۔ چنانچہ جب اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکنی میں جانا چھوڑ دیا۔ خدا بخش سے اس نے بارہا کہا۔ ”دیکھو میرے حال پر حرم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔ میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں۔“ مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اس کی تشغی کر دی۔ ”جان من! میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں اللہ نے چاہا تو چند دنوں میں ہی بیڑا پار ہو جائے گا۔“

پورے پانچ مہینہ ہو گئے تھے مگر ابھی تک سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔ محروم کا مہینہ سر پر آ رہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ مختار نے لیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قیص بنوائی تھیں۔ جس کی آٹینیں کالی جارجٹ کی تھیں۔ اس کے ساتھ پیچ کرنے کے لیے اس کے پاس کالی سائن کی شلوار تھی جو کا جل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نئیس سائزی خریدی تھی۔ اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس سائزی کے نیچے سفید یوں کی کاپٹی کوٹ پہنے گی۔ کیونکہ یہ نیا فیشن ہے۔ اس سائزی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی محل کا ایک جوتا لائی تھی جو بڑا ناٹک تھا۔ سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس احساس نے بہت دکھ دیا کہ وہ محروم نہ کے لیے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت مغموم تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک پھوڑا اس اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے گھر بالکل خالی تھا۔ خدا بخش حسب معمول باہر تھا۔ ویر تک وہ دری پر گاؤں تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی رہی۔ پر جب اس کی گردون اونچائی کے باعث اکڑی گئی تو باہر بالکنی میں چلی گئی تاکہ غم افزای خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔ سامنے پڑیوں پر گاڑیوں کے ذبے کھڑے تھے پر انجمن کوئی نہ تھا۔ شام کا وقت تھا۔ چھڑکا وہ ہو چکا تھا۔ اس لیے گرد و غبار دب

گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جوتا ک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اوچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ مسکرا دی اور اس کو بھول گئی۔ کیونکہ اب سامنے پڑا یوں پر ایک انجمن تمودار ہو گیا تھا۔ سلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجمن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے یہ عجیب و غریب خیال دماغ سے نکلنے کی خاطر جب اس نے سرک کی جانب دیکھا تو اسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا۔ جس نے اس کی طرف لچائی نظروں سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا۔ اس آدمی نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا۔ کہاں سے آؤں۔ سلطانہ نے اسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا مگر پھر بڑی پھرتی سے اوپر چلا آیا۔

سلطان نے اسے دری پر بٹھایا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلہ گفتگو شروع کرنے کے لیے کہا۔ ”آپ اوپر آتے ذریعوں رہے تھے؟“ وہ آدمی یہ سن کر مسکرا یا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا۔۔۔۔۔ ذر نے کی بات ہی کیا تھی؟“ اس پر سلطان نے کہا۔ ”یہ میں نے اس لیے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے۔“ وہ یہ سن کر پھر مسکرا یا۔ ”تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ میں تمہارے اوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو خینہ گا دکھار ہی تھی۔ مجھے یہ منظر پسند آیا۔ پھر بالکونی میں بزر بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لیے تھہر گیا۔ بزر روشنی مجھے پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جائزہ لیتا شروع کر دیا۔ پھر وہ انٹھ کھڑا ہوا۔ سلطان نے پوچھا۔ ”آپ جا رہے ہیں؟“ اس آدمی نے جواب دیا۔ ”تمہیں میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں؛ چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ۔“

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھائے۔ اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معاشرہ کیا۔ جب وہ دونوں پھرائی کمرے میں آگئے چہاں پہلے بیٹھے تھے تو اس آدمی نے کہا۔ ”میرا نام شنکر ہے۔“

سلطان نے پہلی بار غور سے شکر کی طرف دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں۔ کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوتی تھی۔ گھٹیلا اور کسرتی بدن تھا۔ کنپیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ خاکستری رنگ کی گرم پتلوں پینے تھا۔ سفید قیص تھی جس کا لارگر دن پر سے اور پروکواٹھا ہوا تھا۔

شکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شکر کے بجائے سلطان نہ گا کہ ہے۔ اس احساس نے سلطان کو قدرے پر بیٹھا کر دیا۔ چنانچہ اس نے شکر سے کہا۔ ”فرمائیے!“

شکر بینجا تھا، یہ سن کر لیٹ گیا۔ ”میں کیا فرمادیں، کچھ تم ہی فرماؤ۔ بلا یا تمہیں نے ہے مجھے۔“ جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اٹھ بیٹھا۔ ”میں سمجھا، لواب مجھ سے سنو جو کچھ تم نے سمجھا، غلط ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے۔ مجھے جب بلا یا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے۔“

سلطانہ یہ سن کر چکرائی مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار بھی آگئی۔ ”آپ کیا کام کرتے ہیں؟“

شکر نے جواب دیا۔ ”یہی جو تم لوگ کرتے ہو۔“

”کیا؟“

”تم کیا کرتی ہو؟“

”میں ..... میں ..... میں کچھ بھی نہیں کرتی۔“

”میں بھی کچھ نہیں کرتا۔“

سلطانہ نے بھنا کر کہا۔ ”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے۔“

شکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ”تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہوگی۔“

”جھک مارتی ہوں۔“

”میں بھی جھک مارتا ہوں۔“

”تو آؤ دو توں جھک ماریں۔“

”حاضر ہوں، مگر جھک مارنے کے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا۔“

”ہوش کی دوا کرو۔ یہ لئکر خانہ نہیں۔“

”اور میں بھی والہیں نہیں۔“

سلطانہ یہاں رک گئی۔ اس نے پوچھا۔ ”یہ والہیں کون ہوتے ہیں؟“

شکر نے جواب دیا۔ ”لوکے پٹھے۔“

”میں لوکی پٹھی نہیں۔“

”مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ضرور الوکا پٹھا ہے۔“

۲۷۳

”اس لیے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدار سیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگتالے کی طرح بند ہے۔“ یہ کہہ کر شکنگر ہنسا۔

اس پر سلطانہ نے کہا۔ ”تم ہندو ہو اسی لئے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہو۔“

ٹکر مسکرا یا۔ ”اسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے۔ بڑے بڑے پنڈت اور مولوی بھی یہاں آئیں تو شریف آدمی بن جائیں۔“

”اسی شرط پر جو پہلے بتاچکا ہوں۔“

سلطانہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”تو جاؤ رستہ پکڑو۔“

شکر چلا گیا اور سلطانہ کا لے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی اس آدمی کی یاتوں نے اس کے دکھ کو بہت پلا کر دیا تھا۔ اگر وہ ان بالہ میں آیا ہوتا جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا ہوتا۔ مگر یہاں چونکہ وہ بہت اداس رہتی تھی اس لیے شکر کی باتیں اسے پسند آئیں۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اسے پوچھا۔ ”تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟“

خدا بخش تھک کر چور چور ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ ”پرانے قلعے کے پاس سے آ رہا ہوں۔ وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے نہ ہرے ہوئے ہیں۔ انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں۔“

”کچھ انہوں نے تم سے کہا؟“

کافیں شامل حال رہا تو ضرور وارے نمارے ہو جائیں گے۔“

سلطانہ کے دماغ میں محروم نانے کا خیال سایا ہوا تھا۔ خدا بخش سے روپی آواز میں کہنے لگی۔ ”سارا سارا دون غائب رہتے ہو۔

میں یہاں پھرے میں قید رہتی ہوں۔ کہیں جا سکتی ہوں نہ آ سکتی ہوں۔ محروم پر آگیا ہے، کچھ تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں۔ گھر میں پھوٹی کوڑی تھک نہیں۔ لگنگیاں تھیں سودہ ایک ایک کر کے بک گئیں۔ اب تم ہی بتاؤ کیا ہو گا؟ یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے پھرا کرو گے؟ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دہلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری سنوتوا اپنا کام شروع کر دو۔ کچھ تو سہارا ہوئی جائے گا۔“

سلطان نے بات کاٹ کر کہا۔ ”تم خدا کے لیے کچھ کرو۔ چوری کرو یا ذاکرہ ڈالو۔ میرے پاس سفید بوکی کی قمیض پڑی ہے، اس کو میں رنگوں والوں گی۔ سفید نیون کا ایک نیادو پسہ بھی میرے پاس موجود ہے۔ وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لا کر دیا تھا۔ یہ بھی قمیض کے ساتھ ہی رنگوں والی جائے گا۔ ایک صرف شلوار کی کسر ہے۔ سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو۔ دیکھو تمہیں میری جان کی قسم کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو۔ میری بھتی کھاؤ اگر نہ لاو۔“

خدا بخش انہو بیٹھا۔ ”اب تم خواہ مخواہ زور دیئے چلی جا رہی ہو۔ میں کہاں سے لا اوں گا۔ افیم کھانے کے لیے تو میرے پاس ایک پسروں نہیں۔“

”کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساشن لا دو۔“

”دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے۔“

”لیکن تم کچھ نہیں کرو گے۔ تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو۔ جنگ سے پہلے یہ سائنس بارہ چودہ آنے گزیں جاتی تھی۔ اب سورا و پی گز کے حاب سے ملتی ہے۔ ساڑھے چار گز وہ پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟“

”اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حلیلہ کروں گا۔“ یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا۔ ”لواب ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں۔“ ہوٹل سے کھانا آیا۔ دونوں نے نمل کر زہر مار کیا اور سو گئے۔ صبح ہوئی۔ خدا بخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی۔ کچھ دیر لیٹی رہی۔ کچھ دیر سوئی رہی۔ ادھر ادھر کمروں میں ٹہلکی رہی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نیون کا دوپٹہ اور سفید بوکی کی قیص نکالی اور نیچے لانڈری والے کورنگنے کے لیے دے آئی۔ کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام بھی

ہوتا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آ کر فلموں کی کتابیں پڑھیں۔ جن میں اس کے دیکھنے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی۔ جب انھی تو چار بجے چکے تھے۔ کیونکہ دھوپ آنکن میں سے سوری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ نہاد ہو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اور ٹھوپ بالکوئی میں آ کھڑی ہوئی۔ قریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکوئی میں کھڑی رہی۔ اب شام ہو گئی تھی بیاں روشن ہو رہی تھیں یعنی سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے۔ سردی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی۔ مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی۔ وہ سڑک پر آتے جاتے ناگلوں اور موڑوں کی طرف ایک عرصہ سے دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً سے شکر نظر آیا مکان کے یعنی پہنچ کر اس نے گردن اوپنجی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اسے اوپر بلایا۔

جب شکر اور پراجیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے۔ دراصل اس نے ایسے ہی بلا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا تھا۔ شکر بے حد مطمئن تھا۔ جیسے اس کا اپنا گھر ہے چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح گاؤں تکیہ سر کے یعنی رکھ کر لیٹ گیا۔ جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا۔ ”تم مجھے سودفعہ بلا سکتی ہو اور سودفعہ ہی کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ۔ میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔“

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی۔ کہنے لگی۔ ”نہیں بیٹھو، تمہیں جانے کو کون کہتا ہے۔“

شکر اس پر مسکرا دیا۔ ”تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں۔“

”کیسی شرطیں؟“ سلطانہ نے پس کر کہا۔ ”کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟“

”نکاح اور شادی کیسی؟----- ن تم عمر بھر کسی سے نکاح کرو گئی نہ میں۔ یہ رسمیں ہم لوگوں کے لیے نہیں۔ چھوڑوان فضولیات کو۔ کوئی کام کی بات کرو۔“

”بولو، کیا بات کروں؟“

”تم عورت ہو۔----- کوئی اسی بات شروع کرو جس سے دو گھنٹی دل بھل جائے۔ اس دنیا میں صرف دکانداری ہی دکانداری نہیں، کچھ اور بھی ہے۔“

سلطانہ ذہنی طور پر اب شکر کو مقبول کر چکی تھی۔ کہنے لگی۔ ”صاف صاف کہوم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”جو دوسرا سے چاہتے ہیں۔“ شکر انھوں کر بیٹھ گیا۔

”تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا۔“

”تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور مجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہیں، خود بھئنا چاہیں۔“

سلطان نے تھوڑی دیر تک شکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی، پھر کہا۔ ”میں سمجھ گئی۔“

”تو کہو، کیا ارادہ ہے؟“

”تم جیتنے میں ہاری۔ پر میں کہتی ہوں، آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہوگی۔“

”تم غلط کہتی ہو۔ اسی محلے میں تمہیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی جو کبھی یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے۔ جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو۔ لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو۔۔۔۔۔ تمہارا نام سلطانہ ہے نا؟“

”سلطانہ تھی ہے۔“

شکر انہ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا۔ ”میرا نام شکر ہے۔ یہ نام بھی عجب اور پٹا نگ ہوتے ہیں۔ چلو آؤ اندھر چلیں۔“

شکر اور سلطانہ دری والے کرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے۔ نہ جانے کس بات پر جب شکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا۔ ”شکر میری بات مانو گے؟“

شکر نے جوابا کہا۔ ”پہلے بات بتاؤ۔“

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی۔ ”تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر۔۔۔۔۔“

”کہو کہوڑک کیوں گئی ہو؟“

سلطانہ نے جرات سے کام لے کر کہا۔ ”بات یہ ہے کہ محروم آرہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کر میں کالی شلوار بنو سکوں۔ یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔ قیص اور دو پیٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوں کے لیے دے دیا ہے۔“

شکر نے یہ سن کر کہا۔ ”تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں جو تم یہ کالی شلوار بنو سکو۔“

سلطانہ نے فوراً ہی کہا۔ ”نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار لادو۔“

شکر مسکرا یا۔ ”میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے۔ بہر حال میں کوشش کروں گا۔ محروم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار

مل جائے گی۔ لے بس اب خوش ہو گئیں۔ ”سلطانہ کے بندوں کی طرف دیکھ کر پھر اس نے پوچھا۔ ”کیا یہ بندے تم مجھے دے سکتی ہو؟“

سلطان نے ہن کر کہا۔ ”تم انہیں کیا کرو گے؟ چاندی کے معمولی بندے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔“

اس پر شکر نہ کہا۔ ”میں نے تم سے بندے مانگے ہیں۔ ان کی قیمت نہیں پوچھی۔ بولو دیتی ہو؟“

"لے لو" یہ کہہ کر سلطان نے بندے اتار کر شکر کو دے دیئے۔ اس کے بعد اسے افسوس ہوا مگر شکر جا چکا تھا۔

ٹنکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اس کی پتلون میں ٹکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کراٹھا ہے اور سیدھا اوھرہی چلا آیا ہے۔

سلطانہ نے کاغذ کھولا۔ سائن کی کالی شلوار تھی۔ ایسی ہی جیسی کروہ مختار کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت خوش تھی۔ بندوں اور اس سودے کا جو افسوس اسے ہوا تھا، اس شلوار نے اور ٹھنکر کی وعده ایسا ٹائی نے دور کر دیا۔

سلطان نے جواب دیا۔ ”آج ہی درزی لایا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس کی نظر میں مختار کے کانوں پر پڑیں۔ ” یہ بندے تم نے کہاں سے ملکوائے ہیں؟“

مختار نے جواب دیا۔ ”آج ہی مٹکوائے ہیں۔“

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر خاموش رہتا ہے۔



## سفید جھوٹ

ماہوار رسالہ "ادب لطیف" لاہور کے سال نامہ ۱۹۷۲ء میں میرا ایک افسانہ بعنوان "کالی شلوار" شائع ہوا تھا جسے لوگ فخش سمجھتے ہیں ایسے سفید جھوٹ ہے۔

افسانہ نگاری میرا پیشہ ہے۔ میں اس کے تمام آداب سے واقف ہوں۔ اس سے پیشتر اسی موضوع پر میں کئی افسانے لکھے چکا ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی فخش نہیں۔ میں آنکھ بھی اس موضوع پر افسانے لکھوں گا جو فخش نہیں ہوں گے۔

قصہ کوئی ہبتو آدم سے جاری ہے۔ اور میرا خیال ہے قیامت تک جاری رہے گی۔ اس کی شکلیں بدلتی جائیں گی۔ لیکن انسان اپنے احساسات دوسرے اذہان تک پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھے گا۔ میساوں پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ ہر اس شے کے متعلق لکھایا کہا جاتا ہے جو سامنے موجود ہو۔ میساوں اب سے نہیں ہزار ہا سال سے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ان کا ذکرہ الہامی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ اب چونکہ کسی الہامی کتاب یا پیغمبر کی گنجائش نہیں رہی، اس لیے موجودہ زمانے میں ان کا ذکر آپ آیات میں نہیں بلکہ اخباروں، رسالوں یا کتابوں میں دیکھتے ہیں جنہیں آپ عودا اور لوبان جلانے بغیر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھنے کے بعد روی میں بھی اٹھوا سکتے ہیں۔ میں ایک ایسا انسان ہوں جو ایسے رسالوں اور ایسی کتابوں میں لکھتا ہے اور اس لیے لکھتا ہے کہ اسے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ میں جو کچھ دیکھتا ہوں، جس نظر اور جس زاویے سے دیکھتا ہوں، وہی نظر وہی زاویہ میں دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

اگر قام لکھنے والے پاگل تھے تو آپ میرا شمار بھی ان پاگلوں میں کر سکتے ہیں۔ "کالی شلوار" کا پس منظر ایک ویشا کا گھر ہے۔ یہ گھر بننے کے گھر کی طرح حیرت انگیز نہیں جس کے متعلق عجیب و غریب باتیں مشہور ہیں۔ دہلی میں ایسی عورتوں کے لیے ایک مقام منتخب کر کے بے شمار گھر بنائے گئے ہیں۔ میری سلطانہ ایسے ہی ایک بننے بنائے گھر میں رہتی تھی۔ اس نے بننے کی طرح یہ گھر خوب نہیں بنایا تھا۔ وہ بننے کی طرح رات کے جنپو کپڑا کر اپنا گھر روشن نہیں کرتی۔ روشنی پیدا کرنے کے لیے بجلی موجود تھی۔ اور چونکہ یہ بجلی مفت نہیں مل سکتی اور نہ رہنے کے لیے مکان ہی کرائے کے بغیر مل سکتا ہے، اس لیے اسے مزدوری کرنا پڑتی تھی۔ وہ اگر بیاہی ہوتی تو اسے یہ سب چیزیں مفت مل جاتیں۔ لیکن وہ بیاہی نہیں، محض ایک عورت تھی۔۔۔۔۔ اور جب عورت کو بجلی کے پیسے دینے پڑیں، گھر کا

کرایہ ادا کرنا پڑے اور جس کے پلے خدا بخش سا آدمی پڑ جائے جو فقیروں کے پیچھے مارا مارا پھرے تو ظاہر ہے کہ وہ اسی عورت نہیں ہوگی جو ہم اپنے گھروں میں دیکھتے ہیں۔

میری سلطانہ چکلے کی ایک عورت ہے۔ اس کا پیشہ وہی ہے جو چکلے کی عورتوں کو کون نہیں جاتا۔ قریب قریب ہر شہر میں ایک چکلا موجود ہے۔ بدرہ اور سوری کو کون نہیں جانتا۔ ہر شہر میں بدوں میں اور سوریاں موجود ہیں جو شہر کی گندگی باہر لے جاتی ہیں۔ ہم اگر اپنے مرمریں غسل خانوں کی باتیں کر سکتے ہیں، اگر ہم صابن اور لیونڈ رکاذ کر سکتے ہیں تو ان سوریوں اور بدوؤں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے جو ہمارے بدن کا میل پیٹتی ہیں۔ اگر مندروں اور مسجدوں کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان قبچہ خانوں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے جہاں سے لوٹ کر انسان مندروں اور مسجدوں کا رخ کرتے ہیں۔ اگر ہم افیون، بھنگ، چرس اور شراب کے ٹھیکوں کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان کو ٹھوں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے جہاں ہر قسم کا نشا استعمال کیا جاتا ہے؟

بھنگیوں سے چھوٹ چھات کی جاتی ہے۔ اگر کوئی بھنگی ہمارے گھر سے گندگی کا ٹوکر اٹھا کر باہر نکل تو ہم اپنی ناک پر رومال ضرور رکھ لیں گے۔ ہمیں گھن بھی آئے گی مگر ہم بھنگیوں کے وجود سے تو مذکرنہیں ہو سکتے۔ اس فضلے سے تو انکار نہیں کر سکتے جو ہر روز ہمارے جسم سے خارج ہوتا ہے۔ قبض، پتھر، اسہال وغیرہ دور کرنے کے لیے دوائیں اسی لیے موجود ہیں کہ ہمارے جسم سے فاسد مادے کا اخراج ضروری ہے۔ گندگی کے نکاس کے لیے نئے طریقے سوچے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ گندگی ہر روز مجمع ہوتی جاتی ہے۔ اگر ہمارے جسم میں انقلاب برپا ہو جائے اور اس کے افعال بدل جائیں تو ہم قبض، پتھر اور اسہال کی باتیں نہیں کریں گے یا اگر گندگی کے نکاس کے لیے کوئی میکانگی طریقے ایجاد ہو جائیں تو بھنگیوں کا وجود باقی نہیں رہے گا۔

ہم اگر بھنگیوں کے متعلق بات کریں گے تو یقیناً کوڑے کر کٹ اور گندگی کا ذکر آئے گا۔ اگر ہم ویشیاوں کے متعلق بات کریں گے تو یقیناً ان کے پیشے کا ذکر آئے گا۔

ویشیا کے کوئی پرہم نماز یا درود پڑھنے نہیں جاتے۔ وہاں ہم جس غرض سے جاتے ہیں، ظاہر وہاں ہم اس لیے جاتے ہیں کہ وہاں ہم جا سکتے ہیں۔ وہاں جا کر اپنی مطلوبہ جنس بے روک توک خرید سکتے ہیں۔ جب وہاں جانے کی ہمیں کھلی اجازت ہے جب ہر عورت اپنی مرضی پر ویشیا بن سکتی ہے اور ایک لائنس لے کر جسم فرودی شروع کر سکتی ہے جب یہ تجارت قانوناً جائز تسلیم کی جاتی ہے تو اس کے متعلق ہم کیوں بات چیت نہیں کر سکتے؟

اگر ویشیا کا ذکر نہیں ہے تو اس کا وجود بھی نہیں ہے۔ اگر اس کا ذکر منوع ہے تو اس کا پیشہ بھی منوع ہونا چاہیے۔ ویشیا کو مٹائیے اس

کا ذکر خود بخود مٹ جائے گا۔

ہم دیکھوں کے متعلق کھلے بندوں باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم نایوں، ڈھوپیوں، کنجزوں اور بھٹیاروں کے متعلق بات چیت کر سکتے ہیں۔ ہم چوروں، اچکوں، ٹھگوں اور راہنماوں کے قصے سن سکتے ہیں۔ ہم جنوں اور پریوں کی داستانیں بیٹھ کے گھر سکتے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب آسمان کی طرف شیطان بڑھنے لگتا ہے تو ڈتوڈ کر اسے مارتے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک تیل اپنے سینگوں پر ساری دنیا اٹھائے ہوئے ہے۔ ہم داستان امیر حمزہ اور قصہ طوطا میں تصنیف کر سکتے ہیں۔ ہم لندھوں پہلوان کے گرز کی تعریف کر سکتے ہیں۔ ہم عمرو عیار کی ٹوپی اور زنبیل کی باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم ان طوطوں اور میناوں کے قصے سن سکتے ہیں، جو ہر زبان میں باتیں کرتے تھے۔ ہم جادوگروں کے منتروں اور ان کے توڑ کی باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم عمل ہمراہ اور کیمیا گری کے متعلق جو من میں آئے کہہ سکتے ہیں۔ ہم داڑھیوں، پاجاموں اور سر کے بالوں کی لمبائی پر لڑ جھوڑ سکتے ہیں۔ ہم روغن جوش، پلا، اور قورمہ بنانے کی فنی فنی ترکیبیں سوچ سکتے ہیں۔ ہم یہ سچ سکتے ہیں کہ بزرگ کے کپڑے پر کس رنگ اور کس قسم کے بٹن بھیں گے۔ ہم دیشیا کے متعلق کیوں نہیں سوچ سکتے؟ اس کے پیشے کے بارے میں کیوں غور نہیں کر سکتے؟ ان لوگوں کے متعلق کیوں کچھ نہیں کہہ سکتے جو اس کے پاس جاتے ہیں؟

ہم ایک نوجوان لڑکے اور ایک نوجوان لڑکی کا باہمی معاشرہ کر سکتے ہیں، ان کی پہلی ملاقات داتا ٹجھ بخش کے مزار پر کر سکتے ہیں۔ ایک دلال بڑھائیچ میں لا سکتے ہیں جو ان دونوں پچھڑی روحوں کو بار بار ملاتی رہے۔ ہم آخر میں ان کے عشق کو ناکام بنانے کے ذریعے آپس میں ملا سکتے ہیں اور اگر ضرورت محسوس ہو تو اپر سے فرشتوں کے ہاتھوں سے پھولوں کی بارش بھی کر سکتے ہیں۔ ہم دیشیا کی زندگی کیوں بیان نہیں کر سکتے؟ اسے تو فرشتوں اور ان کے پھولوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اگر مرتی ہے تو دوسرے محلے سے کوئی جنازہ اس کی موت کا ساتھ نہیں دیتا۔ کوئی قبر اس کی قبر سے ملنے کی خواہش نہیں کرتی۔

دیشیا کا مکان خود ایک جنازہ ہے جو سماج اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔ وہ اسے جب تک کہیں دفن نہیں کرے گا، اس کے متعلق باتیں ہوتی ہی رہیں گی۔

یہ لاش گلی سڑی ابد بودا رہی، متضمن سہی بھیانک سہی، گھناؤنی سہی، لیکن اس کا مند دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ کیا یہ ہماری کچھ نہیں لگتی۔ کیا ہم اس کے عزیز واقارب نہیں۔ ہم کبھی کفن اٹھا کر اس کا مند دیکھتے رہیں گے اور دوسروں کو دکھاتے رہیں گے۔

میں نے ”کالی شلوار“ میں اسی لاش کا منہ دکھایا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

”سرک کی دوسری طرف مال گودام تھا۔ جو اس کونے سے اس کو نہ بچیا ہوا تھا۔ داشنے پا تھے کو لو ہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گاٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال و اسباب کے ڈھیر سے لگ رہے تھے۔ باسیں پا تھے کو کھلا میدان تھا۔ جس میں بے شمار ریل کی پڑیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لو ہے کی یہ پڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پڑیاں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں، بھی اور ہر کبھی ادھر ان انجنوں اور گاڑیاں کی چمک چمک پچک پچک سدا گوئی بچھی رہتی تھی۔ صبح سورے جب وہ انٹھ کر بالکونی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا۔ دھند لکھ میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھوں نکلتا تھا اور گدے آسان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح احتتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پڑیاں سے اٹھتے تھے اور آنکھ جھکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھمل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہوا کیلے پڑیاں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کائنے بدلتے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔ نہ جانے کہاں پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو گا اور وہ کہیں رک جائے گی۔ ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہو گا۔“

ذین پڑھنے والوں کے لیے اس سے اچھے اشارے اور کیا ہو سکتے ہیں۔ سلطانہ کی زندگی کا صحیح نقشہ ان اشاروں اور کنایوں میں نے پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ دہلی کی میونسلی نے دہلی کی ویشاوں کے لیے ایک خاص جگہ مقصر کرتے وقت یہ ہو سوچا ہو گا کہ مال گودام ان کی زندگی کا صحیح نقشہ پیش کرتا ہے لیکن جو صاحب نظر ہیں وہ ان مکانوں اور مال گودام کو آمنے سامنے دیکھ کر ”کالی شلوار“ جیسے کئی افسانے بلکھیں گے۔

اسی لاش کا ایک بار میں نے یوں بھی منہ دکھایا تھا۔ میں اپنے مشہور افسانے ”ہٹک“ کا آغاز ان سطور سے کرتا ہوں۔ ”دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹتی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی، میوپل کمپنی کا دار و غصانی ہے وہ سینٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی۔ ابھی ابھی اس کی پڑیاں پسلیاں چھنچھوڑ کر شراب کے نشے میں چور گھر کو واپس گیا تھا۔ وہ رات کو یہاں بھی تھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔“

”دور و پے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بد لے اس دار و غصے وصول کیے تھے اس کی چست اور پھول بھری چولی کے

نیچے سے اوپر کوا بھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے گھنکھنا نے لگتے اور اس کی گھنکھنا ہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھمل مل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکون کی چاندی پھیل کر اس کے دل کے خون میں پک رہی ہے۔“

”اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ گرمی کچھ تو اس برانڈی کے باعث تھی جس کا ادھادار وغہ اپنے ساتھ لا یا تھا اور کچھ اس ”بیوڑا“ کا نتیجہ تھی جس کا سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔“

”وہ ساگوان کے لبے اور چوڑے پنگ پر اوندھے من لیٹی تھی۔ اس کی بائیں جو کاندھوں تک نگلی تھیں، پنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں، جو اس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ داکیں بازو کی بغل میں شکن آلو ڈگوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار موئڈنے کے باعث سیاہی مائل رنگت اختیار کر گیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک گلزارہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔“

یہ سلطانہ کی ایک بہن سو گندھی کی تصویر ہے۔ اس کے پاس خدا بخش کے بجائے ایک خارش زدہ ستا تھا۔ خدا بخش سلطانہ کا دل نہ بہلا سکا، مگر یہ خارش زدہ کتا سو گندھی کے بہت کام آیا۔ میں اس افسانے کے آخر میں لکھتا ہوں۔

”کتا اپنی نند منڈم بہلاتا سو گندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھر پھر انے لگا تو سو گندھی چوگی۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا۔ ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے۔ جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اسیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شید میں بالکل اکیلی کھڑی ہے۔ یہ خلا جوا چانک سو گندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت نے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھوٹتی تھی مگر بالکل چھلنی کا ساحاب تھا۔ ادھر دماغ کر پر کرتی تھی، ادھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔ بہت دیر تک وہ بید کی کری پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنادل پر چانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پنگ پر اسے پہلو میں لانا کر گئی۔“

کون ہے جو یہ تصویریں دیکھ کر لذت حاصل کرنے کے واسطے ان ویشاوں کے کوٹھے پر جائے گا۔ میری ”سلطانہ“ اور میری ”سو گندھی“ تھائی میں دیکھنے والی تصویریں نہیں ہیں جن کے اشتہار آئے دن اخباروں میں چھپتے رہتے ہیں۔ وہ کوئی نیا جوڑا اور آسن پیش نہیں کرتیں وہ اسماں کا کوئی خاندانی نہیں بتاتیں۔ وہ کوئی لچھے دار آپ بیتی ہیں ساتھیں کہ شہوانی جذبات ابھر آئیں۔

میرا زیر بحث افسانہ "کالی شلوار" اگر آپ غور سے پڑھیں تو ذہل کی باتیں آپ کے ذہن میں آئیں گی۔

۱۔ سلطانہ ایک معمولی ویشا ہے۔ پہلے انبالہ میں پیشہ کرتی تھی۔ بعد میں اپنے دوست خدا بخش کے کہنے پر دہلی چلی آئی۔ یہاں اس کا کاروبار نہ چلا۔

۲۔ خدا بخش خدا پر ناجائز بھروسہ کرنے اور فقیروں کی کرامات پر ایمان لانے والا آدمی تھا۔

۳۔ سلطانہ کا جب کاروبار نہ چلا تو وہ بہت افسردہ ہوئی۔ اس کی افسردگی میں اور اضافہ ہو گیا، جب خدا بخش فقیروں کے پیچھے مارا مارا چھرنا لگا۔

۴۔ محروم پر آگیا۔ سلطانہ کی دوسری سہیلوں نے کام لے کر ہرے بنوالیے مگر وہ نہ بنوا سکی اس لیے کہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

۵۔ اس موقع پر شکر آتا ہے۔ ایک آوارہ گرد۔ ذہانت، حاضر جوابی اور خوش گفتاری کے علاوہ جس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ سلطانہ کے پاس آتا ہے اور اپنی ان خوبیوں کے معاونتے میں اس سے وہ جنس طلب کرتا ہے جسے وہ دام لے کر فروخت کرتی ہے۔ سلطانہ یہ قبول نہیں کرتی۔

۶۔ دوسری مرتبہ شکر خود نہیں آتا بلکہ اس سلطانہ سے خود بلاتی ہے اور اسے اپنے نہبڑے پانی ایسی زندگی میں ایک حادثے کے طور پر قبول کر لیتی ہے۔ اس سے مل کر وہ خوش ہوتی ہے مگر یہ احساس اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا کہ محروم کے لیے اس کے پاس کالی شلوار کی کمی ہے۔ وہ شکر سے کہتی ہے "محروم آ رہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں۔ یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔ قیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رکھوانے کے لیے دے دیا ہے۔"

۷۔ شکر، محروم کی پہلی تاریخ کو ایک کالی شلوار سلطانہ کے لیے آتا ہے۔ خدا بخش کا خدا اور خدار سیدہ بزرگوں پر غیر ضروری اعتقاد کام نہیں آتا، لیکن شکر کی ذہانت کام آ جاتی ہے۔

یہ افسانہ پڑھ کر دل و دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے۔۔۔۔۔ کیا اس کا پلاٹ یا اس کا انداز بیان لوگوں کو ویشاوں کی طرف کھینچتا ہے؟ میں اس کے جواب میں کہوں گا، ہرگز نہیں۔ اس لیے کہ یہ اس مقصد کے لیے نہیں لکھا گیا۔ اگر اس کو پڑھ کر ایسا اثر پیدا نہیں ہوتا تو افسانہ اخلاقیت سے گرا ہوانہ نہیں ہے۔ اگر یہ اخلاقیت سے گرا ہوانہ تو یہ افسانہ ایسا گیت نہیں جسے خط اٹھانے کی خاطر لوگ گائیں اور بار بار گاہیں۔ کوئی گراموفون کمپنی اس کے روکارڈ نہیں بھرے گی؛ اس لیے کہ اس میں جذبات ابھارنے والے دادرے اور ختم یا ان نہیں ہیں۔

”کالی شلوار“ جیسے افسانے تفریح کی خاطر نہیں لکھے جاتے۔ ان کو پڑھ کر شہروانی جذبات کی راہ نہیں پہنچے گلتی۔ اس کو لکھ کر میں کسی شرمناک فعل کا مرحلہ نہیں ہوا۔ مجھے فخر ہے کہ میں اس کا مصنف ہوں۔ میں شکر کرتا ہوں کہ میں نے کوئی ایسی مشنوی نہیں لکھی جس کے اشعار آپ کی خدمت میں نہونے کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

جانا	پانپتے	ہانپتے	سے	پائی	ہاتھا
جانا	جانے	میں	ڈھانپتے	کھلتے	
وہ	ترا	منہ	سے	منہ	بھرا
جانا	تراء	جب	کا	لڑا	
جانا	تراء	بیمار	سے	لپٹ	
اور	دل	کھول	کے	چھٹ	جانا
ہوئے	ہوئے	لپکرنے	ہوئے	گلنا	
ڈھیلے	ہاتھوں	سے	مارنے	گلنا	
منہ	سے	کچھ	کچھ	پڑے	کے
چھوٹ	جانے	کے	گوں	تکے	جانا
تحک	کے	کہنا	خدا	کے	واسطے چھوڑ
نیند	آئی	ہے	اب	مجھے	نہ ججھجوڑ
وہ	ترا	ڈھیلے	چھوڑتا	بے	بس
وہ	ترا	ست	ہو	کے	کہنا بس
بات	باتی	نہیں	اب	رہی	تو تو
رات	باتی	نہیں	اب	رہی	تو تو
کہیں	تری	یہ	بات	نبزے	گی گی
یا	یونہی	ساری	رات	نبزے	

مجھ میں باقی کچھ اب تو بات نہیں  
 صحیح بھی ہو چکی ہے رات نہیں  
 دیکھ اب آگے مار بیٹھوں گی  
 یا کسو کو پکار بیٹھوں گی  
 آدمی کی جو رخ نکلے گی  
 من سے کیوں کر نہ چن نکلے گی  
 کبھی پھر بھی تو کام ہووے گا  
 دیکھیو، کون ساتھ سوئے گا!

(اقتباسات از مشنوی میر درد، مطبوعہ نجمن ترقی اردو)

شکر ہے کہ میں اپنی پیاس اور بھوکی خواہشات نفسانی کو پر چانے کے لیے ایسے اشعار نہیں لکھے۔

لب سے لب مرے ملائے رکھنا  
 بازو سے وہ سر اٹھائے رکھنا  
 وہ سینے پہ لیٹ کے ستانا  
 مطلب کے سخن پر روٹھ جانا  
 وہ منہ میں زبان کی لذتیں ہائے  
 ظاہر حرکت سے رفتیں ہائے  
 اپنا جو ہوا کچھ اور ارادہ  
 جی چاہا کہ اس سے بھی زیادہ  
 وہ ہاتھ کو رکھ کے جوش انکار  
 وا کرنے نہ دینا بند شلوار

وہ ہاتھ کو دم بدم جھکنا  
 وہ تکیے پر سر کو دے پکنا  
 آہستہ لگانی آہ لاتیں  
 جیلہ کی کیسی کیسی باتیں  
 وہ زور سے چڑانا  
 وہ ہو کے نگ کاٹ کھانا  
 وہ نیچے پڑے ہی تملانا  
 قابو سے تڑپ کے نکل جانا  
 وہ جیس بجیں ہو کے کہنا  
 کن بے کسیوں سے رو کے کہنا  
 ہے تم کو سبی شغل دن رات  
 اچھی نہیں لگتی مجھ کو یہ بات  
 بھرتا ہی نہیں ہے تیرا جی بس  
 کرتا ہی نہیں ہے تو کبھی بس!

(کلیات مومن، مشنوی دوئم، مطبوعہ نوکشوار لکھنؤ)

عورت اور مرد کے جنسی رشتے کے متعلق اگر اس انداز میں کچھ کہا جائے تو میں اسے معیوب نہیں سمجھوں گا۔ اس لیے کہ یہ ہر بالغ آدمی کو معلوم ہے۔ تہائی میں جب مرد اور عورت ایک بستر پر اس غرض سے لیٹتے ہیں تو اسی قسم کی حیوانی حرکات کرتے ہیں۔ لیکن وہ ایسی خوبصورت نہیں ہوتیں جیسا کہ ان اشعار میں ظاہر ہی گئی ہیں۔ ان کی حیوانیت کو شاعری کے پردے میں چھپا دیا گیا ہے۔ یہ لکھنے والے کی شرارت ہے، جو یقیناً قابل گرفت ہے۔

اگر مرد عورت کے اس حیوانی فعل کا فلم بنایا کر پردے پر پیش کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ اس کو دیکھ کر تمام سلیم الدماغ آدمی نفرت سے منہ پھیر لیں گے۔ لیکن جو اشعار میں نے اوپر نمونے کے طور پر پیش کئے ہیں، وہ اس حیوانی فعل کی ایک غلط تصویر پیش کرتے

اسی شاعری ”دماغی جلت“ ہے۔ لکھنے اور پڑھنے والوں دونوں کے لیے۔ میں اسے مistr بھجتا ہوں۔ میرے افسانے ”کالی شلوار“ میں ایسا کوئی عیب نہیں ہے۔ میں نے اس میں کہیں بھی مرد اور عورت کے جنسی ملاب کو لندیڈ انداز میں بیان نہیں کیا۔ میری سلطانہ سے جو اپنے گا کم گوروں کو اپنی زبان میں گالیاں دیا کرتی تھی اور ان کو والوں کے پٹھے بھجتی تھی، کسی قسم کی لذت یا کسی قسم کے حظ کی توقع کی جاسکتی ہے۔ وہ ایک دکاندار تھی، سطحیت قسم کی دکاندار۔ اگر ہم شراب کی دکان پر شراب کی بوش لینے جائیں تو یہ توقع نہیں کریں گے کہ وہ عمر خیام بنایا ہو گا یا اس کو حافظہ کا سارا دیوان از بر یاد ہو گا۔ شراب کے ٹھکیدار شراب بیچتے ہیں، عمر خیام کی رباعیاں اور حافظ شیرازی کے شعر نہیں بیچتے۔

میری سلطانہ عورت بعد میں ہے، ویشیا سب سے پہلے ہے کیونکہ انسان کی زندگی میں اس کا پیٹ سب سے زیادہ اہم ہے۔ شکر اس سے پوچھتا ہے۔ ”تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہو گی؟“

سلطانہ جواب دیتی ہے۔ ”ججک مارتی ہوں۔-----“

وہ نہیں کہتی کہ میں گندم کا بیو پار کرتی ہوں یا سونے چاندی کی تجارت کرتی ہوں۔ اسے معلوم ہے کہ وہ کیا کرتی ہے۔ اگر کسی ٹاپست سے پوچھا جائے کہ تم کیا کام کرتے ہو تو وہ یہی جواب دے گا ”ٹاپ کرتا ہوں“ میری سلطانہ اور ایک ٹاپست میں کیا فرق ہے۔-----غور کیجئے!



## سہائے

”یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں۔ یہ کہو کہ دولاکھ انسان مرے ہیں۔ اور یہ اتنی بڑی تربیتی نہیں کہ دولاکھ انسان مرے ہیں۔ تربیتی اصل میں یہ ہے کہ مارنے اور مرنے والے کسی بھی کھاتے میں نہیں گئے۔ ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ سمجھا ہو گا کہ ہندو مذہب مر گیا ہے۔ لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کر کے ہندوؤں نے بغلیں بجا لیں کہ اسلام ختم ہو گیا ہے مگر حقیقت آپ کے سامنے ہے کہ اسلام پر ایک بکلی سی خراش بھی نہیں آئی۔ وہ لوگ بے وقوف ہیں جو سمجھتے ہیں کہ ہندوؤں سے مذہب شکار کے جاسکتے ہیں۔ مذہب دین ایمان دھرم یقین عقیدت۔ یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم میں نہیں روح میں ہوتا ہے۔ چھرے چاقو اور گولی سے یہ کیسے فنا ہو سکتا ہے؟“

متاز اس روز بہت ہی پر جوش تھا۔ ہم صرف تین تھے جو اسے جہاز پر چھوڑنے کے لیے آئے تھے۔ وہ ایک غیر معین عرصے کے لیے ہم سے جدا ہو کر پاکستان جا رہا تھا۔ پاکستان، جس کے وجود کے متعلق ہم میں سے کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ ہم تینوں ہندو تھے۔ مغربی پنجاب میں ہمارے رشتہ داروں کو بہت مالی اور جانی نقصان انٹھانا پڑا تھا، غالباً بھی وجہ تھی کہ متاز ہم سے جدا ہو رہا تھا۔ جگل کو لاہور سے خط ملا کہ فسادات میں اس کا چچا مارا گیا ہے تو اس کو بہت صدمہ ہوا، چنانچہ اسی صدمے کے زیر اثر باتوں باتوں میں ایک دن اس نے متاز سے کہا۔ ”میں سوچ رہا ہوں مگر ہمارے محلے میں فساد شروع ہو جائے تو میں کیا کروں گا۔“

متاز نے اس سے پوچھا۔ ”کیا کرو گے؟“

جگل نے بڑی سنبھالی گئی کے ساتھ جواب دیا۔ ”میں سوچ رہا ہوں، بہت ممکن ہے میں تمہیں مار داں۔“

یہ سن کر متاز بالکل خاموش ہو گیا اور اس کی یہ خاموشی تقریباً آٹھ روپے تک قائم رہی اور اس وقت نوٹی جب اس نے اچانک ہمیں بتایا کہ وہ پونے چار بجے سمندری جہاز سے کراچی جا رہا ہے۔

ہم تینوں میں سے کسی نے اس کے ادارے کے متعلق بات چیت نہ کی۔ جگل کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ متاز کی روائی کا باعث اس کا یہ جملہ ہے۔ ”میں سوچ رہا ہوں، بہت ممکن ہے میں تمہیں مار داں۔“ غالباً وہ اب تک بھی سوچ رہا تھا کہ وہ مشتعل ہو کر متاز کو مار سکتا ہے یا نہیں۔ متاز کو جو اس کا جگری دوست تھا۔ بھی وجہ ہے کہ وہ ہم تینوں میں سب سے زیادہ خاموش تھا، لیکن عجیب

بات ہے کہ ممتاز غیر معمولی طور پر باتوں ہو گیا تھا۔ خاص طور پر روائی سے چند گھنٹے پہلے:

صحیح اٹھتے ہی اس نے پینا شروع کر دی۔ اساب وغیرہ کچھ اس انداز سے باندھا اور بندھوا یا جھیسے وہ کہیں سیر و تفریق کے لیے جا رہا ہے۔ خود ہی بات کرتا تھا اور خود ہی ہستا تھا۔ کوئی اور دیکھتا تو سمجھتا کہ وہ بمبی چھوڑنے میں ناقابل بیان سرت محوس کر رہا ہے، لیکن ہم تینوں اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ صرف اپنے جذبات چھپانے کے لیے ہمیں اور اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے بہت چاہا کہ اس سے اس کی یک لخت روائی کے متعلق بات کروں، اشارتاً میں نے جگل سے بھی کہا کہ وہ بات چھیڑے مگر ممتاز نے ہمیں کوئی موقعہ ہی نہ دیا۔

جگل تین چار پیک پی کر اور بھی زیادہ خاموش ہو گیا اور دوسرے کمرے میں لیٹ گیا۔ میں اور برج موہن اس کے ساتھ رہے۔ اسے کئی بل ادا کرنے تھے۔ ڈاکٹروں کی فیسیں دینی تھیں۔ لانڈری سے کپڑے لانے تھے۔ یہ سب کام اس نے ہنستے کھیلتے کئے۔ لیکن جب اس نے ناکے کے ہٹل کے بازو والی دکان سے ایک پان لیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ برج موہن کے کاند سے پر ہاتھ رکھ کر دہا سے چلتے ہوئے اس نے ہولے سے کہا۔ ”یاد ہے برج، آج سے دس برس پہلے جب ہمارا حال بہت پلا تھا، گو بند نے ہمیں ایک روپیہ ادھار دیا تھا۔“

راستے میں ممتاز خاموش رہا، مگر گھر پہنچتے ہی اس نے پھر باتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا، ایسی باتوں کا جن کا سر تھا نہ پیہ، لیکن وہ کچھ ایسی پر خلوص تھیں کہ میں اور برج موہن برابر ان میں حصہ لیتے رہے۔ جب روائی کا وقت قریب آیا تو جگل بھی شامل ہو گیا۔ لیکن جب تیکی بندرگاہ کی طرف چلی تو سب خاموش ہو گئے۔

ممتاز کی نظریں بمبی کے وسیع اور کشاورہ بازاروں کو الوداع کہتی رہیں، حتیٰ کہ تیکی اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئی۔ بے حد بھیڑ تھی، ہزار ہار بیٹھو جی جا رہے تھے۔ خوشحال بہت کم اور بدحال بہت زیادہ۔ بے پناہ بھجوم تھا لیکن مجھے ایسا محوس ہوتا تھا کہ اکیلا ممتاز جا رہا ہے۔ ہمیں چھوڑ کر ایسی جگہ جا رہا ہے جو اس کی دیکھی بھالی نہیں۔ جو اس کے مانوس بنانے پر بھی اجنبی رہے گی۔ لیکن یہ میرا اپنا خیال تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ممتاز کیا سوچ رہا تھا۔

جب کہیں میں سارا سامان چلا گیا تو ممتاز ہمیں عرش پر لے گیا۔ اوہر جہاں آسمان اور سمندر آپس میں مل رہے تھے، ممتاز دیر تک دیکھتا رہا پھر اس نے جگل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ یہ خس فریب نظر ہے۔ آسمان اور سمندر کا آپس میں ملا، لیکن یہ فریب نظر کس قدر لکھ ہے۔ یہ طاپ!

جگل خاموش رہا۔ غالباً اس وقت بھی اس کے دل و دماغ میں اس کی یہ کہی ہوئی بات چکلیاں لے رہی تھی۔ میں سوچ رہا ہوں۔  
بہت ممکن ہے میں تمہیں مارڈاں والے۔

متاز نے جہاز کی بار سے برائی مٹکوائی کیونکہ وہ صبح سے یہی پی رہا تھا۔ ہم چاروں گلاس پاتھوں میں لیے جنگلے کے ساتھ کھڑے تھے۔ رانچو جی دھڑک اور جہاز میں سوار ہو رہے تھے اور قریب قریب ساکن سمندر سرا آئی برندے منڈلارے تھے۔

جگل نے دفعتاً ایک بھی جرے میں اپنا گلاس ختم کیا اور نہایت ہی بھونڈے انداز میں ممتاز سے کہا۔ ”مجھے معاف کر دینا ممتاز۔

میرا خیال ہے میں نے اس روز تمہیں دکھ پہنچایا تھا۔“

متاز نے تھوڑے توقف کے بعد جگل سے سوال کیا۔ ”جب تم نے کہا تھا“ میں سوچ رہا ہوں بہت ممکن ہے میں تمہیں مار دالوں۔

کیا اس وقت واقعی تم نے یہی سوچا تھا۔ نیک دلی سے اسی نتیجے پر پہنچے تھے۔“

جگل نے اٹپات میں سرہلا یا۔ ”لیکن مجھے افسوس ہے۔“

”تم مجھے مارڈا لئے تو تمہیں زیادہ افسوس ہوتا۔“ ممتاز نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”لیکن صرف اس صورت میں اگر تم نے غور کیا ہوتا کہ تم نے ممتاز کو ایک مسلمان کو ایک دوست کو نہیں بلکہ ایک انسان کو مارا ہے۔ وہ اگر حرامزادہ تھا تو تم نے اس کی حرما مزدگی کو نہیں ہی بلکہ خود اس کو مارڈا ہے۔ وہ اگر مسلمان تھا تو تم نے اس کی مسلمانی کو نہیں اس کی جستی کو ختم کیا ہے۔ اگر اس کی لاش مسلمانوں کے ہاتھ آتی تو قبرستان میں ایک قبر کا اضافہ ہو جاتا لیکن دنیا میں ایک انسان کم ہو جاتا۔

تحوڑی دیر خاموش رہنے اور کچھ سوچنے کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ ”ہو سکتا ہے میرے ہم مذہب مجھے شہید کرتے، لیکن خدا کی قسم اگر ممکن ہوتا تو میں قبر پھاڑ کر چلانا شروع کر دیتا، مجھے شہادت کا یہ رتبہ قبول نہیں۔ مجھے یہ ذگری نہیں چاہیے، جس کا امتحان میں نے دیا ہی نہیں۔ لا ہور میں تمہارے پچا کو ایک مسلمان نے مارڈا۔ تم نے یہ خبر بھیجی میں سنی اور مجھے قتل کر دیا۔ بتاؤ، تم اور میں کس تمنے کے مستحق ہیں؟ اور لا ہور میں تمہارا پچا اور اس کا قاتل کس خلعت کا حقدار ہے۔ میں تو یہ کہوں گا، مرنے والے کتنے کی موت مرے اور مارنے والوں نے بکار۔۔۔۔۔۔ بالکل بکار اینے ہاتھ خون سے رنگئے۔“

باتیں کرتے کرتے متاز بہت زیادہ جذباتی ہو گیا۔ لیکن اس زیادتی میں خلوص برابر کا تھا۔ میرے دل پر خصوصاً اس کی اس بات کا بہت اثر ہوا کہ مذہب، دین، ایمان، یقین، دھرم، عقیدت..... یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم کے بجائے روح میں ہوتا ہے جو چہرے، چاقو اور گولی سے فانہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔ ”تم بالکل بھیک کہتے ہو۔“

متاز تھوڑی دیر کے لیے رک گیا، جیسے وہ پرانے واقعات اپنے دماغ میں تازہ کر رہا ہے۔ چند لمحات کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ ”اس کا پورا نام مجھے یاد نہیں۔ کچھ ”سہائے“ تھا۔ بنارس کا رہنے والا۔ بہت ہی صفائی پسند۔ وہ جگہ جہاں وہ رہتا تھا گو بہت ہی چھوٹی تھی مگر اس نے بڑے سلیقے سے اسے مختلف خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ پردے کا معقول انعام تھا۔ چار پائیاں اور پلنگ نہیں تھے لیکن گد لیے اور گاؤں کیلئے موجود تھے۔ چادریں اور غلاف وغیرہ ہمیشہ اجلے رہتے تھے۔ تو کہ موجود تھا مگر صفائی وہ خود اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔ صرف صفائی ہی نہیں ہر کام۔ اور وہ سر سے بلا بھی نہیں مالتا تھا۔ دھوکا اور فریب نہیں کرتا تھا۔ رات زیادہ گزر گئی اور آس پاس سے پانی ملی شراب ملتی ہے تو وہ صاف کہہ دیتا تھا کہ صاحب اپنے میے ضائع نہ کجھ۔ اگر کسی بڑی کے متعلق اسے بیک ہے تو وہ چھپا تا نہیں تھا۔ اور تو اور اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ تمیں برس کے عرصے میں تیس ہزار روپے کما چکا ہے۔ ہر دس میں سے ڈھائی کمیشن کے لے لے کر۔ اسے صرف دس ہزار بنانے تھے۔ معلوم نہیں صرف دس ہزار اور کیوں؟ زیادہ کیوں نہیں۔ اس نے مجھ سے کہ تھا کہ تیس ہزار روپے پورے کر کے وہ واپس بنارس چلا جائے گا اور برازی کی دکان کھولے گا۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ صرف برازی ہی کی دکان کھولنے کا آرزو مند کیوں تھا۔“

میں یہاں تک سن چکا تو میرے منہ سے نکلا۔ ”عجیب و غریب آدمی تھا۔“

متاز نے اپنی لفڑیوں کی تھیں اپنی بیٹیاں سمجھتا تھا۔ یہ بھی اس وقت میرے لیے بعد از فہم تھا کہ اس نے ہر لڑکی کے نام پر پوست آفس میں سیونگ اکاؤنٹ کھول رکھا تھا اور ہر میئنے کل آدمی وہاں جمع کرتا تھا۔ اور یہ بات تو بالکل ناقابلِ تھیں تھیں کہ وہ دس بارہ لڑکیوں کے کھانے پینے کا خرچ اپنی جیب سے ادا کرتا ہے۔ اس کی ہر بات مجھے ضرورت سے زیادہ بناؤنی معلوم ہوتی تھی۔ ایک دن میں اس کے یہاں گیا تو اس نے مجھ سے کہا، ایمنہ اور سکینہ دونوں چھٹی پر ہیں۔ میں ہر ہفتے ان دونوں کو چھٹی دے دیتا ہوں تاکہ باہر جا کر کسی ہوٹل میں ماس وغیرہ کھا سکیں۔ یہاں تو آپ جانتے ہیں سب ویشنو ہیں۔ میں یہ سن کر دل ہی دل میں مسکرا یا کہ مجھے بنار ہا ہے۔

ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ احمد آباد کی اس ہندو لڑکی نے جس کی شادی اس نے ایک مسلمان گاہک سے کرائی تھی لاہور سے خط لکھا کہ داتا صاحب کے دربار میں اس نے ایک منت مانی تھی جو پوری ہوئی۔ اس اس نے سہائے کے لیے منت مانی ہے کہ جلدی جلدی اس کے تیس ہزار روپے پورے ہوں اور وہ بنا رس جا کر بڑا زی کی دکان کھول سکے۔ یہ سن کر تو میں ہنس پڑا۔ میں نے سوچا کیونکہ میں مسلمان ہوں اس لیے مجھے خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

میں نے متاز سے پوچھا۔ ”تمہارا خیال غلط تھا؟“

”بالکل اس کے قول فعل میں کوئی بعد نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے اس میں کوئی خامی ہو بہت ممکن ہے اس سے اپنی زندگی میں کئی اغزشیں سرزد ہوئی ہوں۔ مگر وہ ایک بہت عمدہ انسان تھا۔“

بجل نے سوال کیا۔ ”تھیں کیسے معلوم ہوا؟“

”اس کی موت پر“ یہ کہہ کر متاز کچھ عرصے کے لیے خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے ادھر دیکھنا شروع کیا جہاں آسمان اور سمندر ایک وحدتی سی آنکھوں میں سئے ہوئے تھے۔ ”فسادات شروع ہو چکے تھے“ میں علی الصبح اٹھ کر جنڈی بازار سے گزر رہا تھا۔ کرفیو کے باعث بازار میں آمد و رفت بہت سی کم تھی۔ ٹریم بھی نہیں چل رہی تھی۔ ٹیکسی کی تلاش میں چلتے چلتے جب میں جے جے ہسپتال کے پاس پہنچا تو فٹ پا تھا پر ایک آدمی کو میں نے بڑے سے نوکرے کے پاس گھٹھڑی سی بنے ہوئے دیکھا۔ میں نے سوچا کوئی پائی والا (مزدور) سور ہا ہے۔ لیکن جب میں نے پتھر کے نکڑوں پر خون کے لوٹھڑے دیکھے تو رک گیا۔ واردات قتل کی تھی۔ میں

نے سوچا، اپنا راستہ لوں گرلاش میں حرکت پیدا ہوئی۔ میں پھر رک گیا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ میں نے جھک کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے سہائے کا جانا پہچانا چہرہ نظر آیا۔ مگر خون کے دھبیوں سے بھرا ہوا۔ میں اس کے پاس فٹ پاتھر پر بیٹھ گیا اور غور سے دیکھا۔ اس کی نول کی سفید قمیں جو ہمیشہ بے داغ ہوا کرتی تھی لہو سے لتصڑی ہوئی تھی۔ زخم شاید پسلیوں کے پاس تھا۔ اس نے ہولے ہولے کر اپنا شروع کیا تو میں نے احتیاط سے اس کا کندھا پکڑ کر ہلا یا جیسے کسی سوتے کو جگایا جاتا ہے۔ ایک دوبار میں نے اس کو نامکمل نام سے بھی پکارا۔ میں انہی کر جانے ہی والا تھا کہ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ دیر تک وہ ان ادھ کھلی آنکھوں سے لکنکلی باندھے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر ایک دم اس کے سارے بدن میں تشنیج کی ہی کیفیت پیدا ہوئی اور اس نے مجھے پہچان کر کہا۔ ”آپ۔۔۔۔۔۔ آپ؟“

میں نے اسے تلے اوپر بہت سی باتیں پوچھنا شروع کر دیں۔ وہ کیسے اوھر آیا، کس نے اس کو زخمی کیا، کب سے وہ فٹ پاتھر پر پڑا ہے۔ سامنے ہسپتال ہے، کیا میں وہاں اطلاع دوں؟“

اس میں بولنے کی طاقت نہیں تھی۔ جب میں نے سارے سوال کر دا لے تو کہا ہے اس نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ کہے۔ ”میرے دن پورے ہو چکے تھے۔ بھگوان کو یہی مظہور تھا۔“

بھگوان کو جانے کیا مظہور تھا، لیکن مجھے یہ مظہور نہیں تھا کہ میں مسلمان ہو کر، مسلمانوں کے علاقے میں ایک آدمی کو جس کے متعلق میں جانتا تھا کہ ہندو ہے اس احساس کے ساتھ مرتے دیکھوں کہ اس کو مارنے والا مسلمان تھا اور آخری وقت میں اس کی موت کے سرہانے جو آدمی کھڑا تھا، وہ بھی مسلمان تھا۔ میں ڈرپوک تو نہیں، لیکن اس وقت میری حالت ڈرپوکوں سے بدتر تھی۔ ایک طرف یہ خوف دامن گیر تھا، ممکن ہے میں ہی کپڑا جاؤں، دوسرا طرف یہ ڈر تھا کہ کپڑا انہ گیا تو پوچھ چکھ کے لیے دھر لیا جاؤں گا۔ ایک باری یہ خیال آیا، اگر میں اسے ہسپتال لے گیا تو کیا پڑتے ہے، اپنا بدلہ لینے کی خاطر مجھے پھنسا دے۔ سوچ، مرتا تو ہی کیوں نہ اسے ساتھ لے کر مروں۔ اسی قسم کی باتیں سوچ کر میں چلنے ہی والا تھا بلکہ یوں کہئے کہ بھاگنے والا تھا کہ سہائے نے مجھے پکارا۔ میں تھیر گیا۔ نہ تھیر نے کے ارادے کے باوجود میرے قدم رک گئے۔ میں نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا، گویا اس سے کہہ رہا ہوں، جلدی کرو میاں مجھے جاتا ہے۔ اس نے درود کی تکلیف سے دوہرا ہوتے ہوئے بڑی مشکلوں سے اپنی قیص کے بٹن کھولے اور اندر ہاتھ ڈالا۔ مگر جب کچھ اور کرنے کی اس میں ہمت نہ رہی تو مجھ سے کہا۔ ”یچے بندی ہے۔۔۔۔۔ ادھر کی جیب میں کچھ زیور اور بارہ سورہ پے ہیں۔۔۔۔۔ یہ سلطانہ کا مال ہے۔ میں نے۔۔۔۔۔ میں نے ایک دوست کے پاس رکھا ہوا تھا۔۔۔۔۔ آج اسے۔۔۔۔۔ آج اسے بھیجنے والا تھا۔۔۔۔۔ کیونکہ۔۔۔۔۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں خطرہ بہت بڑھ گیا ہے۔۔۔۔۔ آپ

اے دے دیجئے گا۔۔۔ اور۔۔۔ کہنے گا فوراً چلی جائے۔۔۔ لیکن۔۔۔ اپنا خیال رکھئے گا۔“

متاز خاموش ہو گیا، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آواز سہائے کی آواز میں جو بے بے ہبتال کے سامنے فٹ پاتھ پر ابھری تھی، دور ادھر جہاں آسمان اور سمندر ایک دھنڈ لی سی آغوش میں مغم تھے، حل ہو رہی ہے۔

جہاز نے ول دیا تو متاز نے کہا۔“میں سلطانہ سے ملا۔ اس کو زیور اور روپیہ دیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔“

جب ہم متاز سے رخصت ہو کر نیچے اترے تو وہ عرش پر جگلنے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ مل رہا تھا۔ میں جگل سے مخاطب ہوا۔“کیا تمہیں ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ متاز سہائے کی روح کو بدار ہے۔ ہم سفر بنانے کے لیے۔“

جگل نے صرف اتنا کہا۔“کاش! میں سہائے کی روح ہوتا۔“



لوگو

میں سوچ رپا تھا۔

دنیا کی سب سے پہلی عورت جب مان بھی تو کائنات کا ردمک کیا تھا؟

دنیا کے سب سے پہلے مرد نے کیا آسمانوں کی طرف تمثیلی آنکھوں سے دیکھ کر دنیا کی سب سے پہلی زبان میں بڑے فخر کے ساتھ یہ نہیں کہا تھا۔ ”میں بھی خالق ہوں۔“

ٹیلیفون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ میرے آوارہ خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ بالکل سے انٹھ کر میں اندر کمرے میں آیا۔ ٹیلیفون پانچ کی طرح چلائے جا رہا تھا۔

ٹیلیفون بڑی مفید چیز ہے، مگر مجھے اس سے نفرت ہے۔ اس لیے کہ یہ وقت بے وقت بجتے لگتا ہے۔ چنانچہ بہت ہی بد دلی سے میں نے ریسوراٹھایا اور نمبر بتایا۔ ”فور فور فارما ٹیلیفون“

دوسرے سرے سے ہلو ہلو شروع ہوئی، میں جھنجھلا گپا۔ ”کون ہے؟“

جواب ملا "آبا"

میں نے آیاں کے طرز گفتگو میں یوچھا۔ ”کس کو مانگتا ہے؟“

”میں صاحب ہے؟“

”مختصر“

آوازن کر میری بیوی اٹھی اور جماں پاں لیتی ہوئی آئی۔ ”یہ کپانداق ہے، میم صاحب، میم صاحب“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”میم صاحب ٹھیک ہے۔ یاد ہے، تم نے اپنی پہلی آیا سے کہا تھا کہ مجھے میم صاحب کے بد لے بیگم صاحبہ کہا  
واس نے بیگم صاحبہ کو بیٹھن صاحبہ بنادیا تھا۔“

ایک مسکراتی ہوئی جمائی لے کر میری بیوی نے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”دریافت کرو۔“

میری بیوی نے شیلیفون اٹھایا اور ہلو ہلو شروع کر دیا۔ میں باہر بالکنی میں چلا گیا۔ عورت میں شیلیفون کے معاملے میں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ چنانچہ پندرہ میں منٹ تک ہلو ہلو ہوتا رہا۔  
میں سوچ رہا تھا۔

شیلیفون پر ہر دو تین الفاظ کے بعد ہلو کیوں کہا جاتا ہے؟

کیا اس ہلو ہلو کے عقب میں احساس کتری تو نہیں؟ بار بار ہلو صرف اسے کرنی چاہیے جسے اس بات کا اندر یہ شہ ہو کہ اس کی مہمل گفتگو سے تنگ آ کر سننے والا شیلیفون چھوڑ دے گایا ہو سکتا ہے یہ محض عادت ہو۔

دفعتاً میری بیوی گھبرائی ہوئی آئی۔ ”سعادت صاحب! اس دفعہ معاملہ ہتھی سیریس معلوم ہوتا ہے۔“

”کون سامعاملہ؟“

معاملے کی نوعیت بتائے بغیر میری بیوی نے کہنا شروع کر دیا۔ ”بات بڑھتے بڑھتے طلاق تک پہنچ گئی ہے۔ پاگل پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں کہ بات کچھ بھی نہیں ہو گی۔ بس پھر سی کام ہلکنڈ رہنا ہو گا۔ دونوں سر پھرے ہیں۔“

”اجی حضرت کون؟“

”میں نے بتایا نہیں آپ کو؟ اوہ شیلیفون، ظاہرہ کا تھا۔“

”ظاہرہ کون ظاہرہ؟“

”مزینزادی“

”اوہ!“ میں سارا معاملہ سمجھ گیا۔ ”کوئی نیا جھکڑا ہوا ہے؟“

نیا اور بہت بڑا۔ جائیے یزدانی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”مجھ سے کیا بات کرنا چاہتا ہے؟“

”معلوم نہیں۔ ظاہرہ سے شیلیفون چھین کر مجھ سے فقط یہ کہا۔ ”بھابی جان! ذرا منتو صاحب کو بلا یے۔“

خواہ مخواہ میر امفر چانے گا۔“ یہ کہہ کر میں اٹھا اور شیلیفون پر یزدانی سے مخاطب ہوا۔

اس نے صرف اتنا کہا۔ ”معاملہ بے حد نازک ہو گیا ہے۔ تم اور بھابی جان یکسی میں فوراً یہاں آ جاؤ۔“

میں اور میری بیوی جلدی جلدی کپڑے تبدیل کر کے یزدانی کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ہم دونوں نے یزدانی اور طاہرہ کے متعلق بے شمار باتیں کیں۔

طاہرہ ایک مشہور عشق پیشہ موسیقار کی خوبصورت لڑکی تھی۔ عطا یزدانی ایک پٹھان آرٹی کا لڑکا تھا۔ پہلے شاعری شروع کی، پھر ڈرامہ نگاری، اس کے بعد آہستہ آہستہ فلمی کہانیاں لکھنے لگا۔ طاہرہ کا باپ اپنے آٹھویں عشق میں مشغول تھا اور عطا یزدانی علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک کے لیے ”بیلچی“ نامی ڈرامہ لکھنے میں ایک شام پر یہ کرتے ہوئے عطا یزدانی کی آنکھیں طاہرہ کی آنکھوں سے چار ہوئیں، ساری رات جاگ کر اس نے ایک خط لکھا اور طاہرہ تک پہنچا دیا۔ چند ماہ تک دونوں میں نامہ و پیام جاری رہا اور آخر کار دونوں کی شادی بغیر کسی حل جلت ہو گئی۔ عطا یزدانی کو اس بات کا افسوس تھا کہ ان کا عشق ڈرامے سے محروم رہا۔

طاہرہ بھی طبعاً ڈرامہ پسند تھی۔ عشق اور شادی سے پہلے سہیلیوں کے ساتھ باہر شاپنگ کو جاتی تو ان کے لیے مصیبت بن جاتی۔ سخنچ آدمی کو دیکھتے ہی اس کے ہاتھوں میں کھجل شروع ہو جاتی۔ ”میں اس کے سر پر ایک دھول تو ضرور جماوں گی، چاہے تم کچھ ہی کرو۔“ ذہین تھی۔۔۔۔۔ ایک دفعہ اس کے پاس کوئی پیٹی کوٹ نہیں تھا۔ اس نے کر کے گرد ازار بند باندھا اور اس میں سازھی اڑس کر سہیلیوں کے ساتھ چل دی۔

کیا طاہرہ واقعی عطا یزدانی کے عشق میں بہتا ہوئی تھی؟ اس کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یزدانی کا پہلا عشقی خط ملنے پر اس کا رد عمل غالباً یہ تھا کہ کھیل ولچپ ہے کیا ہرج ہے، کھیل لیا جائے۔ شادی پر بھی اس کا رد عمل کچھ اسی قسم کا تھا۔ یوں تو مضبوط کردار کی لڑکی تھی، یعنی جہاں تک باعصمت ہونے کا تعلق ہے، لیکن تھی کھانڈری۔ اور یہ جو آئے دن اس کا اپنے شوہر کے ساتھ لڑائی جھکڑا ہوتا تھا، میں سمجھتا ہوں، ایک کھیل ہی تھا۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے اور حالات دیکھئے تو معلوم ہوا کہ یہ کھیل بڑی خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا۔

ہمارے داخل ہوتے ہی وہ شور برپا ہوا کہ کچھ سمجھھ میں نہ آیا۔ طاہرہ اور یزدانی دونوں اونچے اونچے سروں میں بولنے لگے۔ گلے، ٹکوے، طعنے مبنے پرانے مردوں پر نئی لاشیں، نئی لاشوں پر پرانے مردے۔۔۔۔۔ جب دونوں تھک گئے تو آہستہ آہستہ لڑائی کی نوک پک نکلنے لگی۔

طاہرہ کوشکایت تھی کہ عطا اسٹوڈیو کی ایک وابستہ ایکٹریس کو ٹکیسیوں میں لیے لیے پھرتا ہے۔ یزدانی کا بیان تھا کہ یہ سرا سر بہتان ہے۔

طاهرہ قرآن اٹھانے کے لیے تیار تھی کہ عطا کا اس ایکٹر سے ناجائز تعلق ہے۔ جب وہ صاف انکاری ہوا تو طاهرہ نے بڑی تیزی کے ساتھ کہا۔ ”کتنے پارسا بنتے ہو۔ یہ آیا جو کھڑی ہے، کیا تم نے اسے چونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تو میں اوپر سے آگئی۔“

یزدانی گرچا۔ ”بکواں پند کرو۔“

اس کے بعد پھر وہی شور برپا ہو گیا۔

میں نے سمجھا یا میری بیوی نے سمجھا یا مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ عطا کو تو میں نے ڈانٹا بھی۔ ”زیادتی سراستہ تھاری ہے۔ معافی مانگو اور یہ قصہ ختم کرو۔“

عطانے بڑی سنجیدگی کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ ”سعادت! یہ قصہ یوں ختم نہیں ہو گا۔ میرے متعلق یہ عورت بہت کچھ کہہ چکی ہے۔ لیکن میں نے اس کے متعلق ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔ عنایت کو جانتے ہو تم؟“

”عنایت؟“

”پلے بیک نگر-----اس کے باپ کا شاگرد؟“  
”باں باں“

”اوں درجے کا چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ مگر یہ عورت ہر روز اسے یہاں بلاتی ہے۔ بہانہ یہ ہے کہ----- طاہرہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”بہانہ و بہانہ پکجھ نہیں۔ بولو تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ عطا نے نہایت انتہائی نفرت کے ساتھ کہا۔ ”پکجھ نہیں۔“

طاهرہ نے اپنے ماتھے پر بالوں کی جھال رائیک طرف ہٹائی۔ ”عنایت میرا چاہئے والا ہے۔ بس!“  
عطانے کا لی دی۔ عنایت کو موٹی اور طاہرہ کو چھوٹی۔ پھر شور برپا ہو گیا۔

ایک بار پھر وہی کچھ دھرا یا اگیا جو پہلے کئی بار کہا جا چکا تھا۔ میں نے اور میری بیوی نے بہت شاشی کی مگنتیج وہی صفر۔ مجھے ایسا محوس ہوتا تھا جیسے عطا اور طاہرہ دونوں اپنے جھگڑے سے مطمئن نہیں۔ لڑائی کے شعلے ایک دم بھڑکتے تھے اور کوئی مریٰ نتیجہ پیدا کئے بغیر ٹھنڈے ہو جاتے تھے۔ پھر بھڑکائے جاتے تھے۔ لیکن ہوتا ہوا تا کچھ نہیں تھا۔

میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ عطا اور ظاہرہ چاہتے کیا ہیں مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ مجھے بڑی الجھن ہو رہی تھی۔ دو گھنٹے سے بک

بک اور جھک جاری تھی۔ لیکن انجام خدا معلوم کہاں جھک رہا تھا۔ تلگ آ کر میں نے کہا۔ ”بھی اگر تم دونوں کی آپس میں نہیں بخ  
سکتی تو بہتر یہی ہے کہ علیحدہ ہو جاؤ۔“

ظاہرہ خاموش رہی، لیکن عطا نے چند لمحات غور کرنے کے بعد کہا۔ ”علیحدگی نہیں طلاق،“

ظاہرہ چلائی۔ ”طلاق، طلاق، طلاق۔۔۔۔۔ دیتے کیوں نہیں طلاق۔ میں کب تمہارے پاؤں پڑی ہوں کہ طلاق نہ دو۔“  
عطا نے بڑے مضبوط لبجھے میں کہا۔ ”دوے دوں گا اور بہت جلد۔“

ظاہرہ نے اپنے ماٹھے پر سے بالوں کی جھال رائیک طرف ہٹائی۔ ”آج ہی دو۔“

عطا انھکر شیلیفون کی طرف بڑھا۔ ”میں قاضی سے بات کرتا ہوں۔“

جب میں نے دیکھا کہ معاملہ بگزرا ہے تو انھکر عطا کو روکا۔ ”بیوقوف نہ بنو، بیٹھو آرام سے۔“

ظاہرہ نے کہا۔ ”نہیں بھائی جان، آپ مت رو کے۔“

میری بیوی نے ظاہرہ کوڈا شا۔ ”بکواس بند کرو۔“

”یہ بکواس صرف طلاق ہی سے بند ہو گی۔“ یہ کہہ کر ظاہرہ ناگ بلانے لگی۔

”سن لیا تم نے؟“ عطا مجھ سے مخاطب ہو کر پھر شیلیفون کی طرف بڑھا، لیکن میں درمیان میں کھڑا ہو گیا۔

ظاہرہ میری بیوی سے مخاطب ہوئی۔ مجھے طلاق دے کر اس چڈوا یکٹریس سے بیاہ رچائے گا۔“

عطا نے ظاہرہ سے پوچھا۔ ”اور تو؟“

ظاہرہ نے ماٹھے پر بالوں کے پینے میں بھیکی ہوئی جھال رہا تھا۔ اوپر کی۔ ”میں تمہارے اس یوسف ثانی عنایت خان سے۔“

”بس اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ حد ہو گئی ہے۔ تم ہٹ جاؤ ایک طرف۔“

عطا نے ڈائریکٹری اٹھائی اور نمبر دیکھنے لگا۔ جب وہ شیلیفون کرنے لگا تو میں نے اسے روکنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ ڈائل کیا لیکن نہ برلن ملا۔ مجھے موقعہ ملا تو میں نے اسے پر زور الفاظ میں کہا کہ اپنے ارادے سے باز رہے۔ میری بیوی نے بھی اس سے درخواست کی مگر وہ نہ مانا۔ اس پر ظاہرہ نے کہا۔ ”صفیہ! تم کچھ نہ کہو اس آدمی کے پہلو میں دل نہیں پتھر ہے۔ میں تمہیں وہ خط دکھاؤں گی جو شادی سے پہلے اس نے مجھے لکھے تھے۔ اس وقت میں اس کے دل کا قرار اس کی آنکھوں کا نور تھی۔ میری زبان سے نکلا ہوا صرف ایک لفظ اس کے تن مردہ میں جان ڈالنے کے لیے کافی تھا۔ میرے چہرے کی صرف ایک جھک دیکھ کر یہ بخوبی مرنے کے

لے تا ر تھا۔ لیکن آج اسے میری ذرہ برابر رواہ نہیں۔“

عطانے ایک بار پھر نمبر ملانے کی کوشش کی۔

ظاہرہ بولتی رہی۔ ”میرے باپ کی موسیقی سے بھی اسے عشق تھا۔ اس کو فخر تھا کہ اتنا بڑا آرٹسٹ مجھے اپنی دامادی میں قبول کر رہا ہے۔ شادی کو منظوری حاصل کرنے کے لیے اس نے ان کے پاؤں تک دابے پر آج اسے ان کا کوئی خیال نہیں۔“

عطاو ائل گھا تارہ۔

ظاہرہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”آپ کو یہ بھائی کہتا ہے، آپ کی عزت کرتا ہے۔ کہتا تھا جو کچھ بھائی جان کہیں گے میں مانوں گا۔ لیکن آپ دیکھے ہی رہے ہیں۔ ٹیلیفون کر رہا ہے قاضی کوڈ مجھے طلاق دینے کے لیے۔“

میں نے ٹیلیفون ایک طرف ہٹا دیا۔ ”عطاء اب چھوڑ و بھی۔“

”نمیں“ یہ کہہ کر اس نے شیلیفون اپنی طرف گھیٹ لیا۔

طابہرہ یوں۔ ”جانے دیجئے بھائی جان! اس کے دل میں مجے اکسا، تو تو کا بھی کچھ خال نہیں۔“

عطاتیزی سے پلٹا۔ ”تامنہ لوٹوٹو کا۔“

طاهرہ نے تھنچے پھلا کر کہا۔ ”کیوں نام نہ لوں اس کا؟“

عطانے ریسور کھدیا۔ ” وہ میرا ہے۔ ”

طابہرہ انھ کھڑی ہوئی۔ ”جب میں تمہاری نبیس ہوں تو وہ کسے تمہارا ہو سکتا ہے۔ تم تو اس کا نام بھی نبیس لے سکتے۔“

عطانے کچھ دیر سو جا۔ ”میں سب بندوبست کرلوں گا۔“

طابہرہ کے چہرے پر ایک دم زردی چھا گئی۔ ”ٹوٹو کوچھین لو گے مجھ سے؟“

عطانے بڑے مضغوط لمحے میں جواب دیا۔ ”ہا۔“

٦٣

ظاہرہ نے رونا شروع کر دیا۔ ”نہیں وہ تمہارا ہے۔“

عطانے ظاہرہ کی آنسوؤں بھری آنکھوں کو چومنا شروع کر دیا۔ ”میں تمہارا ہوں، تم میری ہو تو تو تمہارا بھی ہے میرا بھی ہے۔“

میں نے اپنی بیوی کو اشارہ کیا۔ وہ باہر نکلی تو میں بھی تھوڑی دیر کے بعد چل دیا۔ جیسی کھڑی تھی، ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میری بیوی مسکرا رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”یہ تو کون ہے؟“

میری بیوی حکلکھلا کر پڑی۔ ”ان کا لڑکا“

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”لڑکا؟“

میری بیوی نے اثبات میں سر ہلا کیا۔

میں نے اور زیادہ حیرت سے پوچھا۔ ”کب پیدا ہوا تھا؟ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔“

”ابھی پیدائیں ہوا۔۔۔۔۔ چوتھے مینے میں ہے۔“

چوتھے مینے میں، یعنی اس واقعے کے چار مینے بعد میں باہر بالکنی سے بالکل خالی الذہن بیٹھا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتا شروع ہوئی۔ بڑی بے دلی سے اٹھنے والا تھا کہ آواز بند ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میری بیوی آئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”کون تھا؟“

”یزدانی صاحب“

”کوئی نئی لڑائی تھی؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ ظاہرہ کے لڑکی ہوئی ہے میری ہوئی۔“ یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی اندر چل گئی۔

میں سوچنے لگا۔ اگر اب ظاہرہ اور عطا کا جھگڑا ہو تو اسے کون ٹوٹوچکائے گا۔

